تحریک ختم نبوت
حضرت مولانا عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ
ذخیرہ کتب .. محمد احمد ترازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

رفیق محترم جانباز مرزا کے فرزند گرامی عزیز خالد جانباز اور ان کے دوست شیخ پرویز صاحب سیکرٹری مجلس طلبائے اسلام پاکستان (چنیوٹ) یہ فرمائش لے کر تشریف لائے کہ میں شیخ الفاضل محترم عبدالستار خان نیازی ایم اے، ایل ایل بی کے شہدائے ختم نبوت کانفرنس (۱۰ مارچ ۱۹۵۷ء) میں خطاب کا افتتاحیہ لکھوں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان عزیزان گرامی نے اس بار امانت کا قرعہ فال مجھ دیوانے پر کیوں دے مارا ہے؟...... کہاں محترم نیازی صاحب کی بلند و بالا شخصیت اور کہاں یہ کوتاہ قامت شیرازی...... یعنی چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لیکن یہ سوچ کر کہ۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس فرمائش کی تعمیل کر رہا ہوں کہ شاید یہ چند سطور مجھ گناہگار پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بہانہ بن جائیں۔ اور قیامت کے روز خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمت للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامان شفاعت میسر آ جائے۔

محترم شیخ الفاضل عبدالستار خان نیازی، آغا شورش کاشمیری اور جناب ابوسعید انور سے راقم الحروف کی یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ اور یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا۔ نیازی صاحب ہندوستان میں خلافت اسلامی قائم کرتے کرتے تحریک حصول پاکستان کے سیاسی مجاہدین کی صف یعنی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ آغا شورش مجلس اتحاد ملت سے ہوتے ہوئے مجلس احرار اسلام کی سٹیج پر جلوہ فرما ہوئے۔ ابوسعید انور ہم وطنوں کو فارسی اور انگریزوں کو اردو پڑھاتے پڑھاتے مسلم لیگی بن گئے اور راقم الحروف نے غلبہ اسلام کی منزل تک پہنچنے کے لئے اس قافلے کی گرد راہ یعنی خاکسار بننا قبول کر لیا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

لیکن جب ہم سب لوگ منزل تک پہنچے تو ہم نے یہ عجب تماشا دیکھا۔

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اور ہمارے احساسات کی کیفیت اب تک یہ ہے کہ۔

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اپنے آپ کو اقبال میں
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

ہمارے یہی احساسات جب صورت پذیر ہوتے ہیں تو ان لوگوں سے جو پاکستان کے خطہ ارضی کے حصول کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑے۔ اپنے معصوم بچوں کے سروں کو نیزوں کی انی پر رقص بپا کرتے دیکھا۔ اپنی بہنوں اور بچیوں کی عصمتیں لٹتے دیکھیں۔ اپنی ماؤں کی مامتا کو بلکتے دیکھا۔ اپنی بیویوں کے سہاگ اجڑنے کا تماشا دیکھا۔ اگر اس سوال کا جواب آسودگان منزل اثبات میں دیتے ہیں تو پھر مجھے یہ کہنے میں ہرگز باک نہیں کہ دنیا کے تختے پر ان ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ احمق، بے وقوف اور اندھی قوم ہرگز موجود نہیں اور پاکستان کے عوام اور رہنماؤں کو اپنے ملک کا نام فوراً تبدیل کر لینا چاہئے۔ ورنہ مستقبل کا مورخ اس ملک کا تعارف احمقستان کے نام سے کرانے پر مجبور ہوگا......!

لیکن اگر پاکستان سے عبارت ایک ایسا خطہ ارضی ہے جہاں اسلام کی حکمرانی، خدائے بزرگ و برتر کی حکومت اور خاتم الانبیاء سرور کائنات، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شریعت کا قانون نافذ ہوگا اور جو ملک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نعرہ توحید و رسالت کے نتیجے میں مملکت خداداد پاکستان کہلاتا ہے تو اس ملک میں حکومت کی باگ ڈور صرف انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ جن کی گردنوں میں محمد اور صرف محمد کی غلامی کا نقش ثبت ہے۔ ورنہ قانونی اور اخلاقی لحاظ سے ہرگز اس ملک کی کلیدی اسامیوں پر فائز نہیں رہ سکتا۔

اسلام بدھ مت کی طرح انفرادی فعل اور افراد کا ذاتی معاملہ نہیں۔ دین اسلام مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جس سے مسلمان قوم ہر شعبہ زندگی میں رشد و ہدایت حاصل کرتی ہے۔

اس واضح امر کی موجودگی میں جو لوگ دین اور سیاست کو الگ الگ کر کے "ختم نبوت" کے نعرے کو مذہبی جنون کا نام دیتے ہیں۔ وہ یا تو جنت الحمقاء میں بستے ہیں یا دیوانہ بکار خویش ہشیار کے مصداق ہیں۔ ختم نبوت ہی تو وہ مہر ہے، وہ نقش ہے، محمد کی غلامی کا وہ طوق ہے جس کی

بنیاد پر پاکستان کی بلند و بالا عمارت تعمیر اور قائم ہے۔ اس بنیادی پتھر کو نکالنے کی کوشش کرنے والے پاکستان کی عمارت اور اسلام کے ستون کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ تحریک تحفظ ختم نبوت سے کم و بیش چار برس پیشتر علامہ عنایت اللہ خان المشرقیؒ نے پاکستان کو پیش آنے والے جن تین بڑے خطروں کی نشاندہی کی تھی۔ ان میں سب سے بڑا خطرہ قادیانیت کا تھا۔ اس خطرے سے پاکستان کے مستقبل کو محفوظ رکھنا آج بھی انتہائی ضروری ہے۔ بابائے صحافت کہاں یاد آ گئے۔

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں جب حکومت نے نیازی صاحب کو تختۂ دار پر چڑھانے کا حکم صادر کیا۔ راقم الحروف نے روزنامہ "سعادت" لائل پور میں اندھیر نگری چوپٹ راج کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا تھا۔ جس میں اس وقت کے اندھے راجاؤں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ قادیانیت کی گردن میں ڈالنے والا پھانسی کا پھندا نیازی صاحب کی گردن میں صرف اس لئے ڈال رہے ہیں کہ نیازی صاحب کی گردن انہیں اس پھندے کے مطابق دکھائی دے رہی ہے۔

وقت نے ان اندھے راجاؤں کی بساط سلطنت یوں اٹھا پھینکی کہ اب ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں۔ اور نیازی صاحب کی فراخ پیشانی پر ختم نبوت کا نور بدستور چمک رہا ہے اور حشر تک چمکتا رہے گا۔ (انشاء اللہ)

حضرت شیخ الفاضل عبدالستار خان نیازی صاحب نے اپنی اس جامع و مانع تقریر میں تحفظ ختم نبوت کے سیاسی پہلوؤں پر خصوصی توجہ دلا کر عامۃ المسلمین اور ارباب اقتدار کو اس پر غور و فکر کی جو دعوت دی ہے۔ فی الحقیقت اس دعوت پر عمل کرنے میں نہ صرف پاکستان کے قیام و بقاء اور تحفظ استحکام کا راز مضمر ہے۔ بلکہ خود ارباب اقتدار کی فلاح و بہبود، دنیاوی اور اخروی نجات اور حسنات اسی میں پوشیدہ ہے۔ مجلس طلبائے اسلام کے نوجوان کارکن یقیناً لائق تبریک

وتحسین ہیں کہ وہ اس نایاب تقریر کی اشاعت کا بیڑا اٹھا کر سعادت دارین حاصل کر رہے ہیں۔

دفتر ماہنامہ "تذکرہ" لاہور، خاکپائے شہیدان ختم نبوت

(حکیم) آزاد شیرازی

نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به......الخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الذين قالو الا خوانهم وقعدو الو اطاعونا ما قتلوا۔ قل فادرء وا عن انفسكم الموت ان كنتم صدقين۔ ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا۔ بل احياء عند ربهم يرزقون۔ فرحين بما اتهم الله من فضله ويستبشرون بالذين لم يلحقوا بهم من خلفهم الاخوف عليهم ولاهم يحزنون۔ يستبشرون بنعمة من الله وفضل وان الله لايضيع اجرا المؤمنين۔ الذين استجابو الله والرسول من بعدما اصابهم القرح۔ للذين احسنوا منهم واتقوا اجر عظيم۔ الذين قال لهم الناس ان الناس قد جمعوالكم فاخشوهم فزادهم ايمانا وقالوا حسبنا الله ونعم الوكيل۔ فانقلبوا بنعمة من الله وفضل لم يمسسهم سوء واتبعوا رضوان الله۔ والله ذوفضل عظيم۔

(ال عمران: ۱۶۸ تا ۱۷۳)

یہ کانفرنس اس لئے منعقد ہو رہی ہے کہ آج سے چار سال قبل کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے شہداء کی یادگار منائی جائے۔ چونکہ یہ ایک کانفرنس ہے۔ محض ایک جلسہ نہیں۔ اس لئے میں خلاف معمول اپنی معروضات تقریر کے بجائے تحریر کی شکل میں پیش کر رہا ہوں تا کہ جو شرکاء کار یہاں موجود نہیں۔ وہ بھی بیرون جات میں ان مسائل پر غور کر سکیں اور جو احباب یہاں موجود ہیں وہ اس نشست سے اٹھ کر جب واپس جائیں تو زیادہ غور سے ان معروضات کی نسبت سوچ سکیں۔ تحریر کی شکل میں یہ معروضات پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تحریک ختم نبوت کے جو مخالفین تحریک کے موقف کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور یوں اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ وہ آسانی سے ایسا نہ کر سکیں۔

یادگار منانے کا مقصد

یادگار منانے سے مفہوم یہ ہے کہ جس واقعہ یا جس شخصیت یا جس پیغام کی ہم یاد مناتا

چاہتے ہیں۔ جو ہمیں پسند ہے اور جس کی ہمارے دل میں قدر ہے۔ اس کی تفصیلات وقت گزرنے سے ہمیں بھول نہ جائیں۔ اس لئے کہ جن کو وہ تفصیلات یاد ہیں۔ وہ انہیں دہرائیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر یہ دیکھیں کہ جس شے کی ہم یادگار منا رہے ہیں۔ وہ ہمیں کیوں محبوب تھی؟ اس کا کون سا پہلو ہمیں عزیز تھا؟ مدت گزر جانے کے بعد بھی ہم کیوں اسے بھولنے پر آمادہ نہیں؟ اس یاد کو تازہ کرنے سے کیا فائدہ ہے اور جس مقصد کی خاطر وہ شے ہمیں عزیز تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں وہ مقصد کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

تحریک کیوں شروع ہوئی؟

فروری ۱۹۵۳ء کے آخر میں کراچی اور لاہور سے تحریک تحفظ ختم نبوت نے تین مطالبات کو خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت سے منوانے کی خاطر راست اقدام کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ تحریک کی ابتداء ایک مجلس عمل نے کی تھی۔ جس نے یہ پہلے سے بتا دیا تھا کہ تحریک کا مقصد تشدد یا قانون شکنی نہیں۔ بلکہ اس وزارت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنا ہے۔ جو رائے عامہ کے مطالبات کو تسلیم نہیں کرتی۔ خود اپنی جماعت کے فیصلے پر بھی عمل نہیں کرتی اور جس نے سوائے راست اقدام کے اور کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ جس کے ذریعے یہ تین مطالبات منوائے جا سکیں۔ نہ ہی یہ وزارت ملک کا آئین مکمل کرنے پر آمادہ تھی۔ آئین کی تکمیل کی صورت میں عام انتخابات کا بھی امکان نہ تھا۔ جہاں رائے عامہ آئینی طریقے سے اپنے مطالبات پورے کروا سکتی۔

وہ تین مطالبات یہ تھے:

اوّل...... سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ اپنے اس مذہبی عقیدے کا خود اقرار کر چکے ہیں کہ برطانوی حکومت سے وفاداری ان کے دین وایمان میں داخل ہے اور جو شخص کسی غیر مملکت کی حکومت سے شرعی وفاداری اپنے ایمان میں داخل سمجھتا ہو وہ پاکستان کی آزاد مملکت میں وزارت خارجہ جیسے اہم عہدے پر متمکن رہنے کا ہرگز اہل نہیں۔

دوسرا...... مطالبہ یہ تھا کہ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ہر مسئلہ میں جناب خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم نہ کرے اور حضور سرور کائنات ؐ کی تعلیمات میں سے کسی کی تفسیر، تعبیر یا تاویل کا سوال پیدا ہو تو مسلمانوں کی کثرت رائے کے فیصلے کی پابندی کو اپنے لئے ضروری نہ سمجھے۔ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں اسلام کی

تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خاطر ایک وطن قائم کیا جائے۔

لہٰذا جو لوگ پاکستان میں رہنا چاہیں۔ لیکن خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو کسی مسئلہ میں آخری حجت تسلیم نہ کریں۔ یا حضور ﷺ کی کسی تعلیم کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کی پابندی قبول نہ کریں۔ انہیں آئین پاکستان کے ماتحت اقلیت قرار دینا چاہئے۔

تیسرا...... مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں سب سے بڑا مسئلہ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت لانے کا ہے۔ حکومت صرف وزارت کا نام نہیں بلکہ اس میں سرکاری ملازمین کو بھی بڑا دخل ہے۔ لہٰذا جب تک پاکستان میں سرکاری محکموں کی کلیدی آسامیوں پر صرف ایسے سرکاری ملازمین کو مقرر نہیں کیا جاتا جو ہر مسئلہ میں خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات کو آخری حجت تسلیم کریں اور حضور ﷺ کی تعلیم کی تاویل میں مسلمانوں کی کثرت رائے کے فیصلے کی پابندی اپنا ایمان اور منصبی فرض سمجھیں۔ تب تک پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بنایا جا سکتا۔

اس کانفرنس میں تاخیر کیوں ہوئی؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مطالبات تو آج سے پانچ سال قبل پیش کئے گئے تھے۔ ان کے متعلق راست اقدام کی تحریک چار سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس وقت کی وزارت نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے جب مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔ اس واقعہ کو بھی اتنی ہی مدت گزر چکی ہے۔ لیکن آج تک ان شہداء کی یاد منانے کے لئے اس پیمانے پر کانفرنس اس سے پہلے کیوں نہ منعقد ہو سکی۔

مختصر طور پر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب یہ تحریک شروع ہوئی تو اس وقت ایک ایسی وزارت مرکز میں اور صوبے میں برسر اقتدار تھی جو پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت منانے کے وہ وعدے بھول چکی تھی کہ۔

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

یہ وزارت جس ایوان کے سامنے جواب دہ تھی (جیسا کہ بعد میں ایک عدالتی مقدمے کے دوران میں ثابت ہوا) وہ ایوان اپنے آپ کو مختار مطلق اور سلطان مطلق سمجھتا تھا۔ اور جب تک ان کو عدالتی پروانے کے ذریعے ان کی کرسیوں سے برطرف نہ کر دیا گیا۔ تب تک انہوں نے اپنے منصب سے کسی صورت بے پرآمادگی ظاہر نہ کی۔

نمائندہ ستمگار بد روزگار

یہ وزارت اور یہ ایوان بعض سرکاری افسروں کے ساتھ مل جل کر من مانی رنگ رلیاں مناتے تھے۔ لہٰذا جب تحریک تحفظ ختم نبوت نے "راست اقدام" کا آغاز کیا تو ان ارباب اقتدار نے نہ عوام کے مطالبات مانے، نہ "راست اقدام" کرنے والوں کی پر امن عوامی گرفتاریاں قبول کیں۔ بلکہ پہلے ان پر لاٹھی چلائی۔ پھر گولی چلائی اور آخر میں فوج کو دھاوا بولنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد ملک میں ارباب غرض نے ایک ایسی صورت پیدا کر دی کہ ختم نبوت کا نام لینا قانون شکنی کے ہم معنی قرار پایا۔ عام مجرموں کو ارتکاب جرم سے پہلے ارادہ جرم کی سزا نہیں دی جاتی۔ لیکن ختم نبوت کا عقیدہ بیان کرنا بھی کچھ مدت تک جرم قرار پا گیا تھا۔ جب ملک کے قانون نے پورا ساتھ نہ دیا تو سیفٹی ایکٹ سے کام لیا گیا۔ جو غداران وطن کے خلاف استعمال کرنے کی خاطر بنایا گیا تھا۔ جب سیفٹی ایکٹ سے بھی تسلی نہ ہوئی تو بنگال ریگولیشن سے کام لیا گیا۔ جب اس سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا تو مجلس دستور ساز سات سال میں ملک کا دستور نہ بنا سکی تھی۔ اس نے سات گھنٹے کے اندر ایک انڈمنٹی ایکٹ منظور کر دیا۔ جس کا سادے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ حاکم وقت جس کو چاہے ختم نبوت کا نام لینے کے جرم میں جیل کے اندر ڈال دے۔ پھانسی کے تختے پر لٹکا دے۔ جائیداد قرق کرلے، جو فریاد کرے اس کو بھی شریک جرم قرار دے کر جو چاہے سزا دے۔

ظاہر ہے کہ اس سختی اور جبر سے دہشت پھیلی۔ جن کے دل میں دہشت نے اثر نہ کیا، ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ جب ارباب اقتدار فوج کشی پر آمادہ ہو گئے ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے سے ملک کے اندر خانہ جنگی پیدا نہ ہو جائے۔ جو پاکستان ہم نے لاکھوں قربانیوں سے حاصل کیا ہے اس کا استحکام اور سالمیت خطرے میں نہ پڑ جائے۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ وہ گہوارہ ہے جس میں پرورش پانے والے انشاء اللہ العزیز ایک دن دنیا کے اندر اسلامی نظام قائم کر کے ہی دم لیں گے۔ اس لئے عارضی طور پر یہاں ختم نبوت کی تحریک کو کچلنے والے ارباب اختیار سے بھی کھلا تصادم ہمارے مقاصد کے لئے مفید نہ تھا۔

جس قانون کو ہم نے غلط سمجھا اس کا مقابلہ بھی ہم نے قانون کی حد سے آگے بڑھ کر نہ کیا۔ کیونکہ ہم اپنی تلواریں ان دشمنوں کے لئے بچا رکھنا چاہتے ہیں جو صرف ہماری گردنیں ہی

نہیں کاٹنا چاہتے۔ بلکہ ہمارے وطن کو ختم کر دینے کے عزائم رکھتے ہیں۔

قربانی دینے والوں کا صبر کام آیا۔ پہلے صوبے کی وہ وزارت ختم ہوئی جس نے تحریک ختم نبوت کو مکر اور تشدد سے ختم کرنا چاہا تھا۔ پھر وہ مرکزی وزارت ختم ہوئی، جس نے اقتدار کے زعم میں ختم نبوت سے سرکشی کی تھی۔ پھر وہ مجلس دستور ساز ختم ہوئی جس نے انڈمنٹی ایکٹ جیسے قانون بنا کر تحریک ختم نبوت کو خلاف قانون بنانا چاہا تھا۔ تب وہ آئین بھی ختم ہو گیا جس نے اس قسم کی مجلس دستور ساز کو آٹھ سال تک ہمارے سروں پر مسلط کر دیا تھا۔ "ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع ومساجد يذكر فيها اسم الله......الخ" ﴿اللہ تعالیٰ اگر بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں سے ٹکرا کران کا فتنہ دور نہ کر دیتا تو خدا کا نام لینے والے درویشوں کی خانقاہیں اور معابد اور مسجدیں ویران ہو جاتیں اور کوئی خدا کا نام لینے والا باقی نہ رہتا۔﴾

نئے دستور کی سہولتیں

اس کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک نیا دستور پچھلے سال نافذ ہوا۔ ہم اس دستور کو اسلامی لحاظ سے بے نقص نہیں سمجھتے۔ لیکن اس دستور کے بن جانے کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اب ملک میں ایسا کوئی گورنر جنرل باقی نہیں رہا جو ملکہ برطانیہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت میں عوام کے مطالبات کو ہمیشہ قانون کے دائرے کے اندر رہ کر دبا سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرکزی اور صوبائی ایوان کے اراکین ابھی رائے عامہ کے نمائندے نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ عام الیکشن کی تاریخ ہر سال اگلے برس پر ملتوی کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کھیل زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ اب ملک کے اندر آئینی جدوجہد کی ایک ایسی راہ کھل چکی ہے کہ ملک کے باشندوں کی اکثریت اگر کسی بات پر تل جائے تو اس کے ارادے پورے ہونے میں تاخیر تو ڈالی جا سکتی ہے۔ لیکن ان ارادوں کو مٹایا نہیں جا سکتا اور بالآخر ان کی کامیابی سے مفر نہیں اور جو لوگ رائے عامہ کی مخالفت کریں یا اطاعت نہ کریں۔ ان کے زیادہ دیر تک برسر اقتدار رہنے کا بھی امکان نہیں۔

جب میں کہتا ہوں کہ نیا آئین بن جانے کے بعد رائے عامہ کے فیصلوں کو پاکستان میں زیادہ دیر تک نافذ ہونے سے باز نہیں رکھا جا سکتا تو میرا اشارہ صرف عام الیکشن کی جانب نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ عام الیکشن میں بھی بدعنوانیاں اور بے قاعدگیاں کی جا سکتی ہیں۔ میں عام الیکشن کی تیاری اور اس کے نتائج سے زیادہ اہم ملک کی جمہوری رائے عامہ کی تربیت کو خیال کرتا ہوں۔

نئے آئین کے ماتحت عوام کو جو بنیادی حقوق حاصل ہو چکے ہیں اور ان بنیادی حقوق کے نفاذ کے لئے عدالتی پروانہ حاصل کرنے کا جو آسان طریقہ رائج ہو چکا ہے۔ اور اس طریقے کو استعمال کرتے ہوئے ارباب اقتدار کی متعدد بدعنوانیوں کو روکنے میں جو کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ وہ ختم نبوت پر حتمی عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ راہ کھول دیتے ہیں کہ وہ ملک کی رائے عامہ پر اپنے مقاصد کی اہمیت واضح کریں۔ انہیں اپنا ہم نوا بنائیں اور مخالفین نے سچائی کے سورج کو چھپانے کے لئے جھوٹ کے جو بادل پھیلا رکھے ہیں۔ ان کو چاک کر دیں۔ اگر یہ کام سلیقے اور صبر سے انجام دیا جائے۔ تو ان مٹھی بھر مفاد پرستوں کی سازشوں کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ جو تحریک کو بدنام کر کے اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

کانفرنس اب منعقد ہونے کی وجہ

یہ وجہ تھی کہ شہداء ختم نبوت کانفرنس چار سال تک اس پیمانے پر منعقد نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے تازہ حالات میں نہ راست اقدام کی ضرورت باقی ہے۔ نہ تحریک کے عزائم کو آئین اور قانون کی حدود کے اندر پروان چڑھنے سے دشمنوں کی کوئی سازش روک سکتی ہے اور نہ آج کوئی ایسی طاقت ملک کے اندر موجود ہے۔ جو تشدد اور جبر سے اس تحریک کو کچل سکے۔

جب قدرت نے یوں ہمیں چار سال پہلے شمع نبوت پر قربان جانے والے ان پروانوں کی یادگار منانے کا موقع دیا ہے تو آیئے ہم ذرا غور کریں کہ شہادت کیا ہے؟ شہادت کا منصب کیا ہے؟ اسلامی شہید کی وہ کیا خصوصیت ہے جو اسے دنیا کے دوسرے نامور سورماؤں سے ممتاز کرتی ہے۔ جو کسی قومی یا دنیاوی مقصد کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

موت سے بڑی قربانی کوئی نہیں

اس دنیا کی تمام تکالیف اور مصیبتوں کی بابت کہا گیا ہے کہ وہ موت کے ایک جزو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے اگر کافر بھی کسی مقصد کی خاطر اپنی جان قربان کرتا ہے تو ہمیشہ احترام کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ مسلمان جب کسی دنیا کے جھگڑے میں اپنی جان پر کھیل جاتا ہے تو چاہے اس میں دین کے کسی حکم کی خلاف ورزی بھی کی گئی ہو تب بھی مرنے والے سے ایک عجیب قسم کی ہمدردی محسوس کی جاتی ہے۔

دیکھئے چند سال پہلے ڈھاکہ میں بعض بنگالی نوجوانوں نے اس مقصد کی خاطر بلوہ کر دیا کہ سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہئے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح بنگالیوں کو سرکاری نوکریاں زیادہ

ملیں۔ بلوہ میں چند نوجوان مارے گئے۔ اس وقت انہیں مجرم، قوم کے دشمن وغیرہ القاب دیئے گئے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ مدت بعد ایک ایسی پارٹی برسراقتدار آ گئی جو ان مرنے والوں کو شہید کے نام سے یاد کرتی تھی۔ پھر مرکز میں ایک ایسی حکومت بن گئی جو اس بنگالی پارٹی کے ووٹوں کے بغیر حکومت کی گدی پر نہیں بیٹھ سکتی۔ مرکزی اسمبلی کا حالیہ اجلاس جاری تھا کہ کسی نے ان بنگالی زبان کے شہیدوں کی یاد میں اسمبلی کا اجلاس ۵ منٹ تک ملتوی کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ ایوان کی ہر قابل ذکر پارٹی نے اس تجویز کی تائید کی۔

اسی طرح ۱۹۳۰ء میں جب انگریز کے خلاف کانگریس کی تحریک زوروں پر تھی اور صوبہ سرحد کی سرخ پوش تحریک نے کانگریس کے ساتھ شرکت اختیار کر لی تھی۔ تو قصہ خوانی بازار پشاور میں کچھ پٹھان انگریزی فوج سے الجھتے ہوئے مارے گئے۔ بعد میں ان کو بھی شہید کا لقب دے دیا گیا۔ ان کی یاد بھی اب ہر سال دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔

مغربی ممالک میں یہ عام دستور ہے کہ جنگ میں کام آنے والے کسی ایک گمنام سپاہی کی قبر ملک کے دارالحکومت میں بنا دیتے ہیں اور باہر سے آنے والے ہر معزز مہمان اس قبر پر اسی طرح پھول چڑھاتا ہے۔ جیسے پاکستان میں قائداعظمؒ اور شہید ملتؒ کے مزارات پر گلدستے چڑھائے جاتے ہیں۔

مسلمان شہید کی خصوصیت

بلاشبہ وہ تمام لوگ جنہوں نے اپنی قوم کی کوئی خدمت انجام دیتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ وہ اور ان کی یاد ایک احترام کی مستحق ہے۔ لیکن ہم مسلمان جو اپنے آپ کو اسوۂ ملت ابراہیمی کا نام لیوا سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں شہید کے معنی، اس کا مقام اور اس کی یاد منانے کے معنی کچھ مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں قوم کا مفہوم بھی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قوم کے قومی مفاد بھی ان معنوں میں قومی نہیں۔ جس طرح دنیا کی دوسری قوموں کے ہاں اجتماعی مفاد کی نگہداشت ہوئی ہے۔

"ملة ابيكم ابراهيم. هو سمكم المسلمين. من قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيدا عليكم وتكونوا شهداء على الناس (الحج:۷۸)" {تمہاری ملت کا انتساب تمہارے بزرگ ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی تمہیں مسلمان کے نام سے پکارا۔ قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے بھی تمہیں اسی وجہ سے مسلمان کہا جاتا تھا۔

قرآن مجید میں بھی تمہیں مسلمان ہی کا نام دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خاتم النبیین ﷺ تمہارے منصب پر شہادت دیں اور تم انسانیت کے مرتبے کی شہادت دو۔"

دوسرے مقامات پر ملت ابراہیمی کو دوسری قوموں سے ممتاز کرنے والے اوصاف کی یوں تشریح کی گئی ہے کہ: "قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراهیم والذین معه اذ قالوا لقومهم انا برآء منکم ومما تعبدون من دون الله کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوة والبغضاء ابداً حتیٰ تؤمنوا بالله وحده...... الخ (الممتحنہ ۴)" "ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی سنت کی پیروی مسلمانوں کے لئے بہترین دستور ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: اے کافرو تم اللہ کے سوا جن کی پرستش کرتے ہو ہم ان سے اور تم سے بے تعلقی کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے مابین ہمیشہ عداوت اور بغض رہے گا۔ جب تک کہ تم ایک خدا پر ایمان نہیں لاتے۔"

کافر خدا کے سوا جن کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام نے جس رائے کا اظہار کیا وہ قرآن مجید میں ایک مقام پر یوں بیان کی گئی ہے:

"وقال انما اتخذتم من دون الله اوثاناً مودة بینکم فی الحیوٰة الدنیا ثم یوم القیمة یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا ومأوٰکم النار ومالکم من ناصرین (العنکبوت ۲۵)"

ابراہیم علیہ السلام نے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ خدا سے جدا جن بتوں کی پرستش کرتے ہو تمہاری اس پرستش کی بنیاد بتوں سے بھی کسی مخلصانہ وابستگی پر نہیں۔ بلکہ دراصل تم کو دنیا کی زندگی کا لالچ ہے اور دنیا سے یہ مشترکہ لالچ رکھنے کے باعث تمہارے اندر ایک باہمی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اس لگاؤ کی مجسم شکل تم نے بتوں کو بنا لیا ہے۔ لیکن تمہاری اس وابستگی کا پول قیامت کے دن کھل جائے گا۔ (جب دنیاوی تعلقات کے رشتے کٹ چکے ہوں گے۔) تب تم ایک دوسرے سے ان تعلقات کا انکار کرو گے اور باہم لعنتیں بھیجو گے...... الخ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

غرض مسلمان اس لئے ایک ملت ہے کہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کا دین قبول کر لیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کائنات کے حقائق پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ ستارے چاند نکلنے پر مدھم پڑ جاتے ہیں۔ چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے زائل ہو جاتی ہے اور خود سورج بھی

ایک وقت غروب ہو جاتا ہے۔ اس لئے دنیا کے محسوس حقائق جو کہ بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی اصلیت نہیں رکھتے۔ اصلیت اس پائیدار طاقت کو حاصل ہے جو ان سب حقائق کو پیدا کرتی ہے۔ مسلمان اس مٹ جانے والے واقعات سے توجہ ہٹا کر خدا کی ہمیشہ رہنے والی قدرت کے سامنے اپنا رشتہ جوڑنے کا خواہشمند ہے۔ وہ دنیا کی قدر صرف اسی حد تک کرتا ہے۔ جس سے آخرت کی فصل کاٹی جا سکے۔ مسلمان مل کر جب تک قوم کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ تو اس قومیت کے نظام سے بھی ان کا مقصد ایک ایسا طریقہ زندگی رائج کرنا ہے۔ جو انہیں دنیا کے رشتوں سے پاک کر کے اور اونچا اٹھا کر آخرت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع دے۔

دنیا کی دوسری قومیں قومیت کے نظام اس لئے قائم کرتی ہیں کہ کوئی اپنی نسل کو دنیا کی دوسری نسلوں کے حصے کی زمین چھین کر دینا چاہتا ہے۔ کوئی دوسروں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ کوئی تجارت یا دولت کی ترقی چاہتا ہے۔ لیکن مسلمان اپنی شخصیت کی اس نشوونما کا خواہش مند ہے۔ جس کے لئے زمین، نسل اور دولت وسائل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

موت حقیقی زندگی کا آغاز ہے

مولانا رومؒ نے حضرت امیر حمزہؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جوانی میں زرہ پہن کر جنگ کرتے تھے۔ لیکن مسلمان ہوئے تو زرہ اتار کر جہاد میں شامل ہوئے۔ کسی نے پوچھا: آپ جوان تھے تو زرہ پہنتے تھے۔ اب بڑھاپے میں بغیر زرہ کے لڑنا کہاں مناسب ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ جوانی میں طبعی شجاعت کے بل پر جنگ کرتا تھا۔ جیسے پروانہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر آگ کی طرف جاتا ہے۔ تب مقصد موت نہ تھا۔ بلکہ طبیعت کی تسکین کی خاطر موت کے کھیل میں حصہ لیتا تھا۔ بہرصورت خواہش یہی ہوتی تھی کہ موت سے بچ کر دنیاوی کامیابی حاصل کرلوں۔ لیکن اب ایمان لانے کے بعد یہ راز کھلا ہے کہ وہ ناموری جس کی خاطر جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ اصل حقیقت نہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے ایک قدم آگے ہے۔ طبیعت کو جو سکون خطرات برداشت کرنے سے ملتا تھا۔ اس طبیعت کو تسکین دینا ہی اصل مقصد نہیں بلکہ اصلیت اس سے آگے ہے۔ اس لئے اب ایمان لانے کے بعد میں جنگ میں جاتا ہوں تو طبعی جوش کی تسکین یا ناموری حاصل کرنے نہیں جاتا۔ بلکہ ایک برتر زندگی کی تلاش میں جاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مجھے نہ موت سے بچنے کی خواہش ہے اور نہ ناموری کی آرزو میں زندہ رہنے کی خاطر زرہ پہننے کی حاجت۔

لیک از نور محمدؐ من کنوں
نیستم من شہر خاکی راز بوں

(رومیؒ)

میں نے اس تقریر کے آغاز میں جن آیات کریمہ کی تلاوت کی تھی۔ ان میں بھی اس نکتہ کی وضاحت ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ کہتے ہیں۔ وہ خود زندگی اور موت کی حقیقت سے جاہل ہیں۔ اگر یہ دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے تو پھر اعتراض کرنے والو! تم خود کیوں آخرکار اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا لیتے۔ موت یہ ہے۔ جس میں تم دنیا کے قیام کے دوران گرفتار ہوئے اور زندگی وہ ہمیشہ رہنے والی حالت ہے۔ جو اس دنیاوی موت سے چھٹکارا پانے کے بعد تمہیں حاصل ہوگی۔ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو۔ بلکہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے پاس زندگی حاصل کرلی۔ وہاں وہ کھاتے پیتے بھی ہیں اور اللہ کا فضل پانے کی خوشی سے بھی مسرور ہیں۔ اپنے سے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی اپنے جیسی زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں نہ خوف ہے نہ غم۔

وہ یہ بشارت دیتے ہیں کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اللہ کا فضل اور اس کی نعمتیں حاصل کرنے کی راہ کھلی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسولﷺ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ جن کو انہیں دشمنوں کے غلبے سے بد دل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان کی قوت ایمانی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ بہترین مددگار اور بہترین کارساز ہے۔ یہ لوگ اللہ کے فضل سے لدے پھدے واپس آتے ہیں۔ بے شک اللہ بڑا صاحب فضل ہے۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

شہید کے مقام کے متعلق مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ وہی ہے جو میں نے آیات قرآنی کے حوالے سے ابھی بیان کیا ہے۔ ممکن ہے جو لوگ دنیاوی زندگی کی لذتوں کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔ شاید وہ شہداء کی اس روحانی عظمت کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے کی خاطر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس دنیاوی کامیابی اور ترقی کو انہوں نے اپنا معیار بنالیا ہے۔ علاوہ شہداء کی روحانی اور اخروی عظمت کے۔ یہ دنیاوی کامیابی بھی شہداء کے کارناموں ہی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہوتی ہے۔

آج ہم فخر سے سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ روسی اور امریکی بلاک کے مقابلے میں انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اسلامی بلاک بننے کا امکان موجود ہے۔ ذرا غور کرو اگر بدر و حنین اور احد و احزاب کے وہ شہداء اپنی جانیں نچھاور نہ کرتے جن کی تعداد شاید انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے تو آج ہمارا یہ اسلامی بلاک کدھر ہوتا؟ صرف یہی نہیں۔ اس تیرہ سو سال کی مدت میں کیا کیا سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، چشم فلک نے کیا کیا عظمتیں ابھرتی ہوئی دیکھیں۔ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون نے دہلی، کابل، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ میں میں کیا کیا بلندیاں حاصل کیں۔ نہ معلوم روز قیامت تک اسلامی تمدن ابھی مزید کیا کیا عروج حاصل کرتا ہے۔

کیا یہ سب کارنامے، یہ سب فضیلتیں، اگر ہم محض ان کے مادی پہلو پر ہی توجہ دیں اور تھوڑی دیر کے لئے ان شہداء کی ان روحانی عظمتوں سے قطع نظر بھی کر لیں جو میرے اور آپ کے ایمان کے مطابق ان تمام دنیاوی دولتوں سے زیادہ پر شکوہ ہیں۔ تو کیا یہ تاریخ کے تمام درخشندہ صفحات ان چند شہداء کی ذات میں اسی طرح مضمر نہ تھے۔ جس طرح شاہ بلوط کا ایک تناور اور عظیم درخت ایک رائی کے برابر بیج میں چھپا ہوتا ہے۔ صدیوں تک لوگ اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں۔ اس کی ایک ایک شاخ سے شاندار محلات کی چھتیں تعمیر ہوتی ہیں۔ فرنیچر بنتے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ اس ننھے بیج کی قربانی کے بغیر ہو سکتا تھا؟ جس نے اپنی جان نچھاور کر دی تا کہ ان عظمتوں کو جنم دے سکے۔

پاکستان کے اصل معمار شہداء تھے

خود پاکستان کی گزشتہ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالئے۔ ابھی ۴۸ سال ہی تو گزرے ہیں کہ اسی شہر میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ ایک گستاخ ہندو نے رنگیلا رسول نامی کتاب شائع کر کے خاتم النبیین ﷺ کے ناموس پر ہاتھ بڑھانے کی جرأت کی تھی۔ ملک کا قانون ملت اسلامیہ کے اس مرکز کو اور خود کو بچانے سے انکار کر چکا تھا۔ ایک غریب بڑھئی کا نحیف لڑکا اٹھا اور اس نے وہ کارنامہ سر انجام دیا جو بڑی بڑی علم دین رکھنے والی شخصیتوں اور بارسوخ سیاسی لیڈروں کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔ اس ایک شہید کی کوشش سے یہ نتائج برآمد ہوئے کہ قانون بھی بدل گیا۔ عدالت عالیہ کے فیصلے بھی بدل گئے اور جو مسلمان اقلیت کی پوزیشن میں اپنے رسول ﷺ کے ناموس کے تحفظ کے لئے مطالبات کیا کرتے تھے۔ انہیں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت میں ایک مستقل وطن کے مدعی ہونے کا حوصلہ مل گیا۔

مؤرخ کہتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ علامہ اقبالؒ کے الٰہ آباد کے خطبے سے شروع ہوا۔ میں آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ فلسفی کا خواب شہید کے جہاد کا محض ایک عکس تھا۔ جو ہم اور آپ دیکھ سکتے ہیں۔ خبر نہیں اس کے اور کتنے عکس لوح سے لے کر عرش تک ابھی تک ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ان کے آثار سے کیا کیا برکتیں حاصل کریں گی۔

یہ غازی علم الدین شہید کا دکھایا ہوا راستہ تھا۔ جس پر چل کر شہید گنج کی مسجد کو غلط قانون کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کی گئی۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ کوشش ناکام رہی۔ لیکن چشم بصیرت دیکھ سکتی ہے کہ غیر مسلموں کو شہید گنج سے نکالنے کی جو کوشش شروع ہوئی تھی۔ اسی نے تمام مغربی پاکستان کو غیر مسلموں کے غلبے سے نجات دلانے کی مہم کی صورت اختیار کر لی۔

قیام پاکستان کی تحریک میں جن شہداء نے اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ اگر آج ہمیں اپنے گناہوں کے باعث یہ نظر حاصل نہیں کہ ہم عالم اخروی میں ان کی روحانی بلندیوں کو دیکھ سکیں۔ تو کم از کم ان کا یہ اثر ہماری یہ گنہگار آنکھیں بھی دیکھ سکتی ہیں۔ جن کو آخرت کی پرواہ تھی۔ ان کو اللہ نے آخرت کے انعامات سے نوازا اور ان کے جن بھائیوں کو فقط دنیا کی ہوس تھی۔ انہیں شہداء کی قربانیوں کے طفیل ملت کے ان دنیا پرست عناصر کو دنیاوی انعامات سے یوں سیراب کیا کہ جن کو قلم پکڑنا نہ آتا تھا۔ ان کے قلم دفتروں پر حاوی ہو گئے اور جن کو کلرکی میں ترقی کی آرزو رہتی تھی۔ وہ دنیا کے بادشاہوں کی صفوں میں ہم نشین ہونے لگے۔

تحریک ختم نبوت ایک سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ تھی

شہداء ختم نبوت کی ابھی تک تعداد متعین نہیں ہو سکی۔ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں قریوں وادور دیہات میں جو دور ابتلا آیا۔ اس کی تفصیل بھی یک جا قلم بند نہیں ہوئی۔ لیکن میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۵۲ء تک اسلام کے نام پر جس طرح چند پیشہ ور سیاست دانوں نے ایک پولیٹیکل پارٹی کے سوا تمام سیاسی جماعتوں کے گلے گھونٹ دیئے تھے۔ اور بقول پاکستان کی عدالت عالیہ کے جس طرح مجلس دستور ساز نے یہ پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ اگر وہ ابدالآباد تک ملک کا آئین تیار نہ کرتی تو انہی گنے چنے سیاسی بازی گروں نے پاکستان کے سیاسی اقتدار پر اجارہ داری قائم رکھی تھی۔

کیا وجہ ہے کہ تحریک ختم نبوت سے پہلے ملک میں اس جور و استبداد سے نجات دلانے کے لئے کوئی عمومی تحریک نہ اٹھی؟ یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر گورنر جنرل نے اس دستوریہ سے نجات دلائی۔ لیکن گورنر جنرل کے اس اقدام کے لئے سازگار صورتحال کس تحریک نے پیدا کی۔ اگر گورنر

جنرل ہی اس اصلاحی قدم کے محرک اولی تھے۔ تو وہ کیا قوت تھی جس نے گورنر جنرل کی مطلق العنانی کے دور کو استقامت حاصل نہ کرنے دی۔ شاید کہا جائے کہ یہ ملک کی رائے عامہ تھی۔ یا دانشور طبقہ کا جمہوری شعور تھا جس نے یہ کارنامے انجام دیئے۔ لیکن میں اس صورت حال میں یہ دوسرا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا مضراب تھی جس نے ملکی رائے عامہ اور دانشور طبقہ کی رگوں میں چھ سال سے منجمد خون کو پھر زندگی کی گردش سے حرارت عطا کی۔ بلاشبہ یہ شہداء ختم نبوت کے گرم خون کی تپش تھی۔ جس نے اس جمود و تعطل کو دور کیا۔

دنیا کی ہر نعمت شہداء کی قربانی کے طفیل حاصل ہے

اگر خدانخواستہ اس تمام مجمع میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جسے شہداء کی اخروی عظمتوں کے باور کرنے میں ذرا شک ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایسے شخص کی توجہ اس کھلی حقیقت کی طرف مبذول کروادے کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی اسلامی تحریک جس طرح وطن پرستی کی آڑ میں جلب منفعت اور استبدادی حکومت کے استقلال کے راستے پر چل نکلی تھی۔ اس کی باگیں موڑ کر اسے جمہوریت، آئین اور اسلامی اقدار کے راستے پر لانے والی واحد قوت ان شہداء کی قربانی تھی۔ میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ ایسے شخص کے سینے کو اس سیاسی کارنامے کی قدر و قیمت سمجھا کر اس کی بلند تر روحانی عظمتوں کا اندازہ کرنے کی جانب متوجہ کردے۔

اے حاضرین جلسہ! اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالیں۔ اگر ہم صرف ان چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ جن سے ہمیں مادی فائدے اور جسمانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے مکانات اور زمینیں جو باپ دادا سے ورثے میں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ باپ، بیٹے اور بہن بھائی کے رشتے جن سے آنکھوں کو سرور اور دلوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ یہ لذیذ کھانے جو کھائے جاتے ہیں اور پینے کی چیزیں جنہیں پیا جاتا ہے۔ یہ دوستوں کی محفلیں اور یہ برادریوں کی رسمیں جس سے میل جول اور دنیا کے ملاپ قائم ہیں۔ غرض دنیا کی ہر شے اور ہر وہ رشتہ جس سے یہاں آرام ملتا ہے۔ یا دنیا کی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ کیا یہ سب چیزیں اس بات پر قائم نہیں کہ ہمارے معاشرے کے اندر ایک اپنایت کا رشتہ قائم ہے اور ہم میں کم از کم کچھ لوگ بعض اقدار پر متفق ہیں؟ خدانخواستہ اگر ہمارے اندر سے حرام اور حلال، جائز اور ناجائز، برے اور بھلے کی تمیز مٹ جائے تو کون کس کا رہے گا؟ نہ کوئی کسی کا باپ ہوگا اور نہ کوئی کسی کا بیٹا۔ کوئی کسی جائیداد کا مالک ہوگا اور نہ کوئی کسی کا وارث۔ نہ کوئی اپنا ہوگا اور نہ کوئی بےگانہ وغیرہ۔

ہماری قومیت کی بنیاد عشق ناموس رسول ﷺ ہے

اب ذرا ایک لمحہ کے لئے غور کرو کہ یہ سارے رشتے اور یہ سارے بندھن کس کے واسطے سے قائم ہیں۔ کیا یہ ہمارا پیارا اور آخری نبی ﷺ ہی نہیں، جس نے ہمیں سکھایا ہے کہ اس کائنات کا ایک رب بھی ہے۔ اور کیا اسی نے ہمیں آگاہ نہیں کیا کہ قرآن اس برتر اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ اور یہ قرآن نہیں، جس کے بتائے ہوئے دستور سے خاندان قائم رہتے ہیں۔ ان نکات کو فلسفیانہ موشگافیاں نہ سمجھو۔ ذرا سوچو اگر نبی ﷺ کا نام بیچ سے اٹھ جائے تو وہ کیا حد ہوگی۔ وہ کون سی دیوار ہوگی جو تمہیں پٹیل، تارا سنگھ یا نہرو سے جدا رکھے گی اور اگر تم نہ ہو گے تو پاکستان کہاں ہوگا؟ اور اگر پاکستان نہ ہوگا تو یہ حکومت کہاں ہوگی اور قومی غیرت کس شے کا نام ہوگا۔ پھر اگر یہ موٹی بات ہے کہ ان سب رشتوں اور ان تمام وابستگیوں کی جڑ خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ تو جو طاقت تمہیں اس نبی سے جدا کرتی ہے۔ وہ کیا تمہارے ماں، باپ، بھائی، بہن، تمہاری جائیداد اور تمہاری زندگی کی ہر اس خوشی سے تمہیں محروم نہیں کرنا چاہتی۔ جس سے تمہاری دنیاوی زندگی کے یہ سہارے بھی قائم ہیں۔

ایسی شیطانی قوت سے جو تمہیں تمہارے نبی ﷺ سے بیگانہ کرنے کے لئے کوشاں تھی۔ بچانے کی خاطر جن نوجوانوں نے اپنا شباب قربان کر دیا جن بوڑھوں نے بڑھاپے میں جواں ہمتی دکھائی اور جن بچوں نے لڑکپن میں پیرانہ سالی کی دور اندیشی کا ثبوت دیا گیا۔ ان تمام شہداء کے متعلق یہ کہنا کسی قسم کا مبالغہ ہوگا کہ ان کی ہمت کے بغیر تم دنیا کی ہر نعمت سے بھی محروم ہو جاتے؟

دنیا کی سرسبزی خون شہیداں کی سرخی سے سیراب ہے

موسم آئیں گے اور رتیں بدل جائیں گی۔ باران رحمت ہوگی اور شہداء کی قبروں کو دھو کر بہہ جائے گی۔ خزاں کے پتے ہوا سے اڑیں گے۔ اور قبرستانوں میں بکھر جائیں گے۔ موسم بہار میں شبنم اپنے ٹھنڈے آنسو ان مزارات پر ٹپکائے گی جن کو شاید کبھی لوح مزار بھی نصیب نہ ہو۔ لیکن کیا ہم اور ہماری آئندہ نسلیں ان شہداء کا دنیاوی احسان بھی کبھی فراموش کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی جانیں دیں۔ تا کہ تم زندہ رہو۔ جنہوں نے موت کی تلخی چکھی تا کہ تم نشوونما کی مٹھاس سے بہرہ ور ہو سکو۔ جنہوں نے اس دنیا میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ تا کہ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی محفوظ رہے اور آئندہ تم مزید بھی حاصل کر سکو۔ خدانخواستہ اگر ہمارے اندر کوئی ایسا شخص بھی موجود ہے جو مرنے کے بعد ان شہداء کی شفاعت سے رحمتیں حاصل کرنے کی توقع سے محروم

ہو چکا ہے۔ تو میں پوچھتا ہوں وہ کون بدبخت ہوگا۔ جو اس جہاں کی برکتوں سے محرومیت قبول کرنے کے بعد اس جہان کی ایک ایک گھڑی کو بامعنی بنانیوالے عالی حوصلہ عاشقان پاک طینت کی عظمت کا بھی انکار کرے۔

تحریک صرف مذہبی نہیں تھی

اے دوستو! جب ہم ان پاکیزہ روحوں کو فاتحہ کا ثواب پہنچانے سے فارغ ہوں۔ تو آؤ چند منٹ اس پر بھی غور کریں کہ ان جان پر کھیل جانیوالے دلیروں کے روحانی اور مذہبی عزائم پر جہاں ہم نے نگاہ ڈالی ہے۔ وہاں اس عالم اسباب میں وہ کیا حالات تھے۔ جنہوں نے خاص مارچ ۱۹۵۳ء میں انہیں اس تحریک کا علم بردار بننے کی رغبت دی۔

یہ ایک مشہور مسئلہ ہے کہ مسلمان کا دین اس کی دنیا سے جدا نہیں۔ مسلمان کی سیاست اس کی عبادت سے منقطع نہیں۔ باوجود اس کے تحریک تحفظ ختم نبوت کے متعلق یہ ایک افسوسناک سانحہ ہے کہ اس تحریک کو ان معنوں میں بار بار مذہبی تحریک کہا گیا ہے۔ گویا یہ ایک سیاسی، اقتصادی اور عالم گیر تحریک نہ تھی۔ جب مذہبی کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی وہی گت بن جاتی ہے۔ جس طرح "مذہبی سکھوں" کی ترکیب لفظی ہیں۔

مذہب کا اسلامی مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ تحریک تحفظ ختم نبوت ان معنوں میں ایک مذہبی تحریک تھی جن معنوں میں تحریک حصول کشمیر ایک مذہبی تحریک ہے اور جن معنوں میں سود کی ممانعت سے پاکستان کی اقتصادیات کو مغربی بنکاری کے انسانیت کش اثرات سے نجات دلانے کی تحریک ایک مذہبی تحریک ہوگی۔ اس غلط فہمی اور غلط بیانی کی ابتداء اس ماحول میں ہوئی جب کہ راست اقدام کو بغاوت کے مترادف قرار دینے کی ناجائز کوشش جاری تھی۔

تحریک کا مقصد سیاسی بھی تھا

جس شخص نے تحریک تحفظ ختم نبوت کی ابتداء اور ارتقاء کے مراحل کا مطالعہ کیا ہے اور اس وقت کی تقاریر اور جلسوں کی کارروائی اور کارکنوں کی جدوجہد اور تنظیم کی سرگرمیوں پر اس کی نگاہ ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ اس تحریک کے چلانے والوں کو صرف یہ خیال دامن گیر نہ تھا کہ وہ الٰہیات، فقہ یا علم عقائد کا کوئی اصولی مسئلہ بجائے مدرسہ میں طے کرنے کے مسند حکومت پر بیٹھ کر سلجھانے کے خواہشمند تھے۔

بات یہ تھی کہ الٰہیات، فقہ اور علم عقائد کے ایک مسلمہ مسئلہ کو بعض سیاسی، اقتصادی اور عملی سازشوں کی مصلحت نے یوں الجھا دیا تھا کہ بغیر اس مسئلہ کو مسند حکومت پر بیٹھ کر طے کیے نہ ان

سیاسی غداروں کا علاج کیا جا سکتا تھا، جو نبوت کا نور ملکہ وکٹوریہ کے نور سے اخذ کرنا چاہتے تھے۔ نہ ان اقتصادی رخنہ اندازوں کا قلع قمع ہو سکتا تھا جو امریکہ میں پیدا ہونے والے وافر غلے کی منڈی پاکستان میں مہیا کرنے کی خاطر ایک طرف پاکستان کے دریاؤں کا رخ بدلے جانے پر کسی عملی مداخلت کے بجائے یو این او میں ساڑھے بارہ گھنٹے تقریر کرنا کافی سمجھتے تھے۔ اور دوسری طرف ملکی غلے کو بھارت میں سمگل ہونے کا موقع دے کر یہاں مصنوعی قحط کی صورت پیدا کر رہے ہیں۔ نہ ہی ان عالم گیر سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا جو روس اور امریکہ کی لڑائی میں اسلام کے نام پر پاکستانی سپاہیوں سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں کے دوران میں راولپنڈی اور جہلم کے رنگروٹوں نے بغداد اور مصر میں حکومت انگلشیہ کی زریں خدمات بجالا کر انجام دیا تھا۔

تحفظ ختم نبوت کے مسئلہ کے دینی پہلو کو یکسر علیحدہ رکھتے ہوئے تین سراسر دنیاوی مسائل ایسے تھے جو پاکستان کو درپیش تھے۔ اور درپیش ہیں اور جن کا حل سوائے ختم نبوت کے اصول کو پاکستان کی سیاست، پاکستان کی اقتصادیات اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کا محور اور مرکز بنائے بغیر ممکن نہ تھا۔

پاکستان کی سالمیت ختم نبوت کے اعتقادات سے وابستہ ہے

ا...... پہلا مسئلہ پاکستان کی سیاسی ہیئت تشکیل قائم رکھنے اور نشوونما دینے کا تھا۔ میں منصب شہادت کے متعلق قرآنی آیات نقل کرتے وقت آپ کو توجہ دلا چکا ہوں کہ ملت ابراہیمی دنیا میں ایک انوکھی قومیت کی ابتداء تھی۔ امت محمدیہ اسی ملت ابراہیمی کے احیاء کا نام ہے۔ اس ملت کی خصوصیت یہ ہے کہ بر خلاف دنیا کی دوسری تمام قوموں کے یہ ملت محض ان افراد کی حفاظت اور بہبودی کی خاطر قائم نہیں جو اس کے اندر شامل ہیں۔ بلکہ یہ ملت اپنے آپ کو کائنات کی تمام مخلوقات اور دنیا کی تمام دیگر اقوام کی صحیح رہبری کے لئے بھی جواب دہ تصور کرتی ہے۔ اس ملت کی اپنی کوئی نسل نہیں۔ اس میں ہر دوسری نسل کے افراد کے لئے شامل ہونے کا راستہ ہمیشہ کھلا ہے۔ لیکن یہ ملت دنیا میں انسانیت کی ایک نئی نسل پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جس کی نسلی خصوصیات سنت ابراہیمی کی تقلید ہے۔

بیسویں صدی میں پاکستان کا قیام ایک عجوبہ تسلیم کیا گیا۔ اس لئے کہ پاکستان کے دو منطقوں میں نہ جغرافیائی ہمسائیگی ہے نہ زبان مشترک ہے۔ نہ پٹ سن اور روئی کی کاشت اور فروخت یکساں اقتصادی، صوبوں کی پابند ہے۔ صرف دین کا رشتہ ہے، جس کی بناء پر ملک قائم ہوا

اور قائم رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے وضاحت کر چکا ہوں۔ دین کے عام فہم معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آخری نبی ﷺ کی تعلیمات کو زندگی کے ہر مسئلے میں آخری حجت مانا جائے۔ اور ہر زمانے میں جن لوگوں نے اس نبی کی تعلیمات کو زندگی کے ہر مسئلے میں آخری حجت تسلیم کیا ہے۔ ان کی کارگزاری کی روشنی میں نبی ﷺ کی تعلیمات کا مفہوم سمجھا جائے۔ جسے فقہاء کی اصطلاح میں سنت سلف صالحین کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں بھی قرآن وسنت کو سارے آئین کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کی سالمیت برقرار رکھنے کی خاطر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی نبی پر نازل ہونے والی کتاب اور کسی نبی کی سنت آئین کا سرچشمہ ہے۔

ختم نبوت کے بغیر دو قوم کا نظریہ باقی رہے گا نہ ایک پاکستانی قوم

گویا ختم نبوت صرف فقہ اور عقائد کا مسئلہ نہیں۔ یہ پاکستان کے آئین اور ناموس کا مسئلہ ہے۔ یہ مشرقی پاکستان، کشمیر، سرحد، بلوچستان، پنجاب اور سندھ کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے یا ایک دوسرے سے اکھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دینے کا مسئلہ ہے۔ صرف یہی نہیں یہ پاکستان کو بھارت سے جدا کرنے یا بھارت کے ساتھ واپس ملحق کر دینے کا مسئلہ ہے۔ صرف یہی نہیں یہ ہر پاکستانی خاندان کے اندر نسب اور صلہ رحمی کے رشتے قائم رکھنے یا منقطع کر دینے کا مسئلہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بحیثیت ایک مسلمان کے کسی مسلمان کی شخصیت کو قائم رکھنے یا ایک دیوانے کے خواب کی طرح اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے برسرپیکار کر کے۔ اس کی اخلاقی اور ذہنی موت وارد کر دینے یا توحید سے اس کو باغی بنا دینے کا مسئلہ ہے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ کسی شاعری کی مبالغہ آرائی یا کسی واعظ کی محفل آرائی نہیں۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ جس دن سے تحریک تحفظ ختم نبوت کو کچلا گیا ہے۔ اس دن سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین مساوات نمائندگی اور مساوات تقسیم کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جس پختونستان کو ہم جاہلانہ عصبیت کا نام دیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے صدر مملکت اور ایک بیرونی بادشاہ کے مابین موضوع گفت وشنید بن چکا ہے۔ ملک کی ایک کے بجائے دو زبانیں مقرر ہو چکی ہیں۔ جس پنجاب نے پاکستان بنانے کے لئے سب سے زیادہ قربانی دی۔ جس نے سب سے زیادہ مہاجرین کو آباد کیا۔

آج اس کو ساٹھ فی صدی کے بجائے چالیس فی صدی نیابت ملتی ہے۔ اور اونیٰ ملازمتوں میں یہ تناسب بیس سے لے کر تیس فی صدی تک گر چکا ہے۔ مجھ سے زیادہ صوبائی

عصبیتوں کا مخالف کوئی نہ ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان بھائی کا حق دوسرے مسلمان بھائی کو منتقل کر دینا ظلم ہے۔ ظلم سے تعصب مٹا نہیں کرتے بلکہ ہر تعصب کی پرورش کسی ظلم سے ہوتی ہے۔ کل پنجاب کے نام پر بنگال کو اس کثرت آبادی کے حق نیابت سے محروم کیا گیا تھا۔ بعض نادان پنجابی اس پر خوش ہوئے کہ بنگالی بڑے متعصب ہیں۔ اچھا ہے ان کی نیابت کم ہوگئی۔ اس کا صلہ یہ ملا کہ آج خود پنجاب ساٹھ فیصد کے بجائے چالیس فیصد نیابت پاتا ہے اور قبائلی نمائندگی کے نام پر پولیٹیکل ایجنٹوں کے بنائے ہوئے جرگے اسمبلیوں میں نمائندے بھیجتے ہیں۔ غرض ظلم کی جڑ سے ہمیشہ ظلم کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ ظلم اور انصاف کے مابین حد سوائے نبی ﷺ کی شریعت کے اور کسی پیمانے سے کھینچی نہیں جا سکتی۔

نبی ﷺ کی شخصیت کو ملک کی سیاست سے خارج کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود ملک کی سیاست مجہول اور معدوم ہو کر رہ گئی ہے۔ جن بوالعجبیوں پر کبھی مسلم لیگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ آج ملک کی ہر سیاسی پارٹی ان بوالعجبیوں کا عجائب گھر بن کر رہ گئی ہے۔ اور خود مسلم لیگ جو پاکستان کے مخالفین کے مسند اقتدار پر قابض ہو جانے کے شکوے کیا کرتی تھی۔ وہ ملک کی وحدت کی جڑ پر کلہاڑے چلانے والوں کے ساتھ سودا بازی پر مجبور ہے۔

اقتصادی مشکلات کا حل بھی ختم ہے

۲...... دوسرا مسئلہ پاکستان کی اقتصادیات کو کوئی واضح شکل دینے اور اقتصادی مشکلات کو حل کرنے کا تھا۔ یہ مسئلہ آگے میں ضمنی مسائل پر منقسم ہے۔ ایک یہ کہ خوراک کی کمی کس طرح دور ہو۔ اگر ہر سال یہی چلن رہا کہ قرض لے کر ادھار کھاتے رہے تو ایک دن اپنے ساتھ اولاد اور باپ دادا کے ورثے کو بھی خاکم بدہن رہن رکھنے کی نوبت آ جائے گی۔ دوسرا ضمنی مسئلہ صنعت کو ترقی دینے اور صنعت کو زراعت کے مابین توازن قائم رکھنے اور بین الاقوامی تجارت کا کوئی منصوبہ بنانے پر مشتمل ہے۔ تیسرا ضمنی مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے اندر جو دولت یا جائیداد فراہم ہو۔ اس کی تقسیم کسی منصفانہ بنیاد پر ہونی چاہیے۔ تاکہ خواہ مخواہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر نہ ہوتے چلے جائیں۔ کسی باہنر کے کمانے کا راستہ بند نہ ہو اور کسی بے ہنر پر دوسروں کی کمائی ہتھیا لینے کے راستے کھلے نہ رہیں۔

۹ یہ موقع ان مسائل پر تفصیلی بحث کا نہیں۔ مختصر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ضمنی مسئلے کے مختلف حل ہیں۔ مثلاً خوراک کے متعلق کوئی کہتا ہے کہ پہلے کاشتکاروں کے حقوق ملکیت ملنے چاہئیں۔ کوئی کہتا ہے۔ بڑے زمینداروں کو ملکیت سے محروم کرنا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے

کہ قومی ملکیت مسئلے کا اصل حل ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ جس حکومت سے گندم اور چینی کی تقسیم منصفانہ نہیں ہو سکی، زرعی اراضی بھی اس کے ڈپٹی کمشنروں کی قومی ملکیت بن گئی تو زعفران کی طرح پنساری کی پڑیوں میں تلاش کرنی پڑے گی۔ علیٰ ہٰذا القیاس صنعت کے متعلق کسی کا خیال ہے کہ ملکی صنعت کاروں پر بے جا قیود عائد ہیں اور کسی کا خیال ہے کہ ان کو ناجائز نفع کمانے کے مواقع مہیا ہیں۔ دولت اور جائیداد کی مساوی اور منصفانہ تقسیم کے متعلق بھی کمیونزم سے لے کر سرمایہ داری تک مختلف نظریات ہیں۔

میں یہاں ان میں سے کسی نظریہ کی مخالفت یا موافقت بے موقع سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک سوال پوچھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیا ان میں سے کوئی حل بھی اس وقت تک قابل عمل ہو سکتا ہے۔ یا اس سے کوئی مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب تک ملک میں کوئی ایسی قوت پیدا نہ ہو جو اس حل پر واقعی کچھ عرصہ تک استقلال اور ہمت سے عمل کروا سکے۔

یہ تو نہ ہو کہ چار سال میں ایک پنج سالہ منصوبہ بنے اور چار ہفتوں میں اس کو نئی وزارت نامنظور کر دے۔ مزید برآں کوئی حل اسی وقت مفید ہو سکتا ہے۔ جب ملک کے وسیع رقبوں میں اس پر عمل درآمد ہو سکے اور ملک کے مختلف طبقات کے معتدبہ عناصر دل جمعی اور حسن نیت سے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر آمادہ ہوں۔

زرعی اصلاحات بھی ختم نبوت کے سہارے ہی ممکن ہیں

یہ دونوں باتیں یعنی کسی حل پر عمل کرانے کے لئے کسی زبردست قوت کا مہیا ہونا اور ملک کے وسیع رقبوں میں غالب اکثریت کا اس حل کو خوش دلی سے قبول کرنا اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک ملک کی آبادی میں کوئی مشترکہ معیار ایسا نہ ہو۔ جس کے مطابق مختلف خیالات اور مختلف دلائل کو جانچا نہ جا سکے۔

میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان میں سوائے آخری نبی ﷺ کی تعلیمات کے وہ کون سا معیار ہے جسے ملک کے ہر حصے میں ہر شخص بغیر چون و چرا کے قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہمارا ملک ایک دیہاتی ملک ہے۔ جس کی اکثر آبادی ناخواندہ ہے۔ سوائے اسلام کی اصطلاحات کے یہ لوگ نہ کوئی زبان جانتے ہیں۔ نہ کسی علم سے واقف ہیں۔ جس کی وساطت سے مسائل ان کو سمجھائے جا سکیں۔ اکنامکس، فزکس، بیالوجی، سائیکالوجی اور سوشیالوجی کے فارمولے اور باتوں سے قطع نظر محض اس لئے بے کار ہیں کہ خود نسخہ لکھنے والوں کو بھی اکثر اجزاء کا کچھ حال سوائے اس کے معلوم نہیں کہ کسی نے کچھ اس کے متعلق

کہیں کسی زمانے میں بیان کیا تھا اور اس نسخہ کی عطاری کے لئے تو سوائے لندن یا نیویارک کے غیر ملکی ماہرین کے اور کوئی کارآمد ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی گاؤں میں جائیے، کسی شخص کو یہ سمجھائیے کہ بھئی فلاں فعل نہ کرو۔ یہ بڑا اینٹی سوشل ایکٹ ہے یا فلاں منصوبے کی تائید کرو۔ اس سے جمہوریت کو نشوونما ہوگی۔

کیا سو میں سے ننانوے آدمیوں کی سمجھ میں خاک بھی پلے پڑے گی۔ برعکس اس کے خیبر سے لے کر چٹاگانگ تک کسی شخص کو یہ کہئے کہ بھئی یہ فعل مسلمان کو زیب نہیں دیتا اور فلاں تجویز کی اس لئے تائید کرو کہ کالی کملی والےﷺ نے ایسا ہی کیا تھا تو یہ دوسری بات ہے کہ وہ آپ کی رائے سے متفق ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایسا کون ہوگا جو اس بات کو سمجھ نہ جائے۔ عورتیں اور بچے بھی اس زبان کو بخوبی سمجھتے ہیں۔

خارجہ پالیسی بھی ختم نبوت کے اصول کی محتاج ہے

۳...... تیسرا مسئلہ عالمگیر حکمت عملی اختیار کرنے کا تھا۔ جدید ایجادات نے دنیا کی ایسی کایا پلٹ دی ہے کہ دور دراز کے ملک ایک رشتے میں بندھ گئے ہیں۔ بوڈاپسٹ میں بغاوت ہوتی ہے تو کراچی کی سیاست پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ واشنگٹن میں صدر منتخب ہوتا ہے تو بھائی پھیرو کی میونسپلٹی کے عہدے داروں میں تغیر وتبدل کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جمہوری سرمایہ داری سویز اور الجزائر کے زخموں پر پھایہ رکھنے میں قاصر ثابت ہو رہی ہے اور ''دنیا بھر کے مزدور متحد ہو جاؤ'' کا نعرہ لگانے والے ہنگری کے مزدوروں پر گولی چلانے سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس کیفیت میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا محور سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسلامی ملکوں سے رشتے مضبوط کئے جائیں۔

لیکن اسلامی ملکوں سے رشتے مضبوط کرنے کا مطلب کچھ عرصے سے یہی سمجھا گیا ہے کہ دو مسلمان ملکوں کے انگریزی بولنے والے اور پتلون پہننے والے لیڈر کسی سینما میں اکٹھے بیٹھ کر کوئی اطالوی فلم دیکھ لیں۔ یا ایک دوسرے کی صحت کے جام نوش کر لیں۔ چاہے ازروئے تقویٰ قلقل دینا میں سوائے سادہ پانی کے اور کچھ نہ بھرا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی ملاقات کا انتظام واہتمام جس فرنگی لارڈ یا امریکی بینکر کی مدد سے ہوگا۔ اس کے پڑھائے ہوئے میاں مٹھو اپنے استاد کی سکھائی ہوئی ڈرائیں چہ شک) سے زیادہ اور کیا بات کر سکیں گے۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ ملک فیروز خاں نون صاحب کو اسرائیل کی یہودی حکومت کے قیام کی ابدیت میں کوئی شک باقی نہ رہے گا اور وہ پکار اٹھیں گے۔ کہ پندرہ لاکھ یہودیوں کو سمندر میں تو نہیں دھکیلا جا سکتا۔ وہ یہ بھول جائیں گے کہ

ان یہودیوں سے زیادہ تعداد رکھنے والے فلسطینی عربوں کو ان کے وطن سے دھکیلا جا چکا ہے۔

یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ پاکستان، کینیڈا اور فلپائن کی مدد سے کشمیر حاصل کرانے کی امید سے مست ہو کر مصر اور شام کے ساتھ تعلقات بگاڑ لے گا۔ غرض نہرو بڑا بھائی قرار پائے گا اور افغانستان سے سرحد کا جھگڑا نمٹنے میں نہ آئے گا۔

اتحاد عالم اسلام بھی مسئلہ ختم نبوت کے تصفیہ کا منتظر ہے

کیا اس الجھن کا حل سوائے اس کے ہو سکتا ہے کہ مسلمان ممالک سے پاکستان کے تعلقات صرف بادشاہوں، رئیسوں اور رقاصوں کے تبادلے تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ مسلمان عوام ایک دوسرے کے حالات اور مسائل سے آگاہ ہوں۔ لیکن جب ہمارے خارجہ تعلقات کی بنیاد یہ ہو تو کیا خاتم النبیین ﷺ سے وابستگی کے سوا کوئی اور وسیلہ بھی ایسا ہے جو نعت کی موسیقی، مسجد کی عبادات اور قرآن کی زبان کی مانند مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے مسلمانوں کو ایک کر سکے۔

یہ تین مسائل ایسے تھے جو سر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹائے بغیر حل نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ بیرونی ممالک میں آخری نبی ﷺ سے زیادہ پرچار قادیان کے نبی کی تعلیمات کا کیا کرتے تھے۔ نہ ہی ملک میں اس وقت تک سیاسی استحکام پیدا ہو سکتا تھا۔ جب تک حکومت کے اندر ایک دوسری حکومت قائم کرنے والے نظام کا خاتمہ نہ کر دیا جاتا۔ جس کی جداگانہ پولیس، جداگانہ عدالتیں، جداگانہ خزانہ اور جداگانہ بیرونی سفارتیں قائم ہو چکی تھیں۔ غضب یہ ہے کہ اس خانہ ساز حکومت کا پاکستان کی حکومت کے محکموں سے براہ راست ربط قائم ہو چکا تھا۔ خود فوج بھی اس مداخلت کا نشانہ بنائے جانے سے محفوظ نہ تھی۔ جو کام ملکی حکام کے اشارے سے نہ ہو سکتا تھا۔ وہ خلیفہ ربوہ (چناب نگر) کی سفارش سے ہو سکتا تھا۔

راست اقدام کے متعلق غلط فہمیاں

یہ سیاسی، اقتصادی اور بین الاقوامی وجوہات تھیں جن کی بناء پر تحریک تحفظ ختم نبوت نے ۱۹۵۳ء میں راست اقدام کا آغاز کیا۔ راست اقدام کے مفہوم کے متعلق غلط فہمی پھیلانے کی ایسی منظم کوشش کی گئی کہ خود تحریک کے سادہ لوح بھی اس کا مفہوم بھول چکے ہیں۔ یا کم از کم اس کے متعلق الجھاؤ محسوس کرتے ہیں۔ ہم جن شہداء کی یادگار منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کا جذبہ قربانی ان روحانی اور دینی مقاصد سے متعلق تھا۔ جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی اس قربانی کے سیاسی، اقتصادی اور بین الاقوامی نتائج بھی اس قدر اہم ہیں کہ ان کی جدوجہد کے مادی اسباب کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ راست اقدام کے مفہوم کو سمجھنا اس لئے بھی ضروری ہے

کہ تحریک کو آئندہ چلانے کے لئے اس کی گزشتہ تاریخ سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ بحالات موجودہ راست اقدام کی ضرورت نہیں۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں جو راست اقدام کیا گیا تھا اس کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنا اور حقیقت حال کو معلوم کرنا تحریک تحفظ ختم نبوت کے آئندہ پروگرام کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

راست اقدام کی تاریخ

راست اقدام کی تاریخ سمجھنے کے لئے ہمیں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے پر آشوب دور کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر وہ مرد مجاہد تھے جنہوں نے اس برصغیر کے دور غلامی کے حالات پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگریزی استبداد کو ملک کے اندر فتنہ و بغاوت سے ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ فقہ اسلامی کا بھی یہ مسئلہ ہے کہ جب نہ قدرت ہو اور نہ امکان قدرت بلکہ جہاد کے آغاز میں ہی ہلاکت یقینی ہو تو امیر کو حتی الوسع قتال شروع کرنے میں توقف کرنا چاہئے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اس وقت کے تمام سرکردہ علماء سے مشورہ کیا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس وقت جب کہ ملک میں فرنگی کا غلبہ ہے۔ غدار طاقتوں نے انگریز کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس وقت مسلمان جنگ آزادی کے لئے کیا حربہ استعمال کریں۔ ان لوگوں نے بین الاقوامی حالات پر نگاہ کی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی قوت کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب کفر کا مقابلہ مادی لحاظ سے ناممکن ہو جائے تب بھی یہ امکان تو ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ کفر کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ کفر کو ظلم کرنے میں بھی ایسے مجبور کیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے پر مجبور ہوتا جائے۔ حتی کہ ظلم وشدت کی اس انتہا کو پہنچ جائے۔ جہاں سے اس کا جاری رکھنا ظالم کے لئے ناممکن ہو جائے۔

اس نئے حربہ جنگ کو اور نئے اصول جنگ کو تحریک عدم تعاون اور ترک موالات کا نام دیا گیا۔ غالباً اس اصول اور حربے کا سرچشمہ آیت قرآنی تھی کہ "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" نیکی اور بھلائی کے کام میں تعاون کرو۔ لیکن گناہ اور سرکشی سے تعاون نہ کرو۔ خود جواہر لال نہرو کی اپنی خود نوشتہ سرگزشت میں یہ اقرار ہے کہ برصغیر میں پہلی سول نافرمانی مولانا محمد علی جوہر نے جمعیت العلماء کے تعاون سے شروع کی۔ گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس نے کہیں ایک مہینہ بعد جا کر مسلمانوں کی پیروی میں اس سول نافرمانی میں حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن مسلمانوں کو یہ دقت تھی کہ ان کے اخبارات بہت تھوڑے تھے۔ انگریزی زبان میں تو مسلمان کے اخبارات بہت ہی کم تھے۔ اور پھر ان اخبارات میں سے

بھی کئی حکومت وقت کا ساتھ دیتے تھے۔

برعکس اس کے ہندوؤں کے کارخانے اور اخبارات ملک کے اکثر حصوں میں قائم ہو چکے تھے۔ اس لئے گو گاندھی ایک ماہ بعد تحریک آزادی میں مولانا محمد علی جوہر کا پیرو بنا تھا۔ لیکن ہندو پریس نے اس کو یوں اچھالا اور اس کا اتنا چرچا کیا۔ دوسری طرف ہندو مالدار طبقہ اور وکلاء نے اس کثرت سے اور اس گرمجوشی سے گاندھی کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے اس طبقے نے کہ جس کی حکومت میں رسائی تھی، مولانا محمد علی جوہرؒ سے ایسی کنارہ کشی رکھی کہ تحریک عدم تعاون گاندھی سے منسوب ہو گئی۔ گاندھی نے اس تحریک پر اپنا ہندو روغن پھیرنے کی خاطر ایک تو اہنسا کے اصول کا زیادہ چرچا شروع کیا۔ جس کا مطلب عدم تشدد تھا۔ دوسرا اس نے ستیہ گرہ یعنی سچائی پر زیادہ زور دیا۔ انگریزی اخبارات نے اس تحریک کو نان کو آپریشن اور سول ڈس اوبی ڈینس (Non Co-operation & Civil Disobedience) کا نام دیا۔ ۳۲۔۱۹۳۰ء میں جب کانگریس نے دوبارہ اسی طریقے پر حکومت چلائی تو برصغیر میں یہ سیاسی طریقہ کار ایک مسلمہ سیاسی اسلوب فکر و عمل کی شکل اختیار کر گیا۔

اس زمانے میں جب کانگریس کے عہدے دار انگریزی حکومت کو یہ تحریک شروع کرنے کی دھمکیاں دیتے تھے تو اس وقت عدم تعاون کے مقابلے میں سول نافرمانی کی تحریک کو ڈائریکٹ ایکشن کا نام دیا گیا۔

مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے پاکستان کی قرارداد منظور کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب پنجاب کے اندر مسلم لیگ نیشنل گارڈز پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلم لیگ نے بھی سول نافرمانی کی۔ کچھ عرصہ بعد صوبہ سرحد میں بھی مسلم لیگ نے ایسی ہی سول نافرمانی کی۔ قائداعظم جب کانگریس اور انگریزوں پر قیام پاکستان کے مطالبے کو منوانے کے لئے زور دے رہے تھے۔ تو انہوں نے سارے ہندوستان میں ۲۶ رجولائی ۱۹۴۶ء کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے بھی منوایا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کلکتے کے اندر بیچ ہی ہندو اور مسلمانوں میں کچھ مدت کھلی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

برصغیر کی سیاسی تاریخ کا یہ پس منظر تھا جس میں "راست اقدام" کی اصطلاح نے یہ خاص مفہوم اختیار کر لیا تھا کہ جب حکومت وقت عوام کے مطالبات کو تسلیم نہ کرے اور کوئی ایسا آئینی راستہ بھی نہ چھوڑے۔ جس کے ذریعے عوام حکومت کو اپنے مطالبات منوانے پر مجبور

کرسکیں۔ اور عوام کسی مصلحت کی بناء پر حکومت کے ساتھ کھلی جنگ پر آمادہ نہ ہوں اور تشدد و تصادم بھی شروع نہ کرنا چاہیں تو ایسی صورت حال میں عوام یہ چارہ کار بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ کسی ایک قانون کی پرامن اور اصطلاحی نافرمانی سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ حکومت جو ووٹ بیلٹ میں ڈال کر فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ ووٹر جیل میں داخل ہو کر انہی ووٹوں کا شمار دنیا کی رائے عامہ پر ظاہر کر دیں اور اس اخلاقی دباؤ سے حکومت کو اپنے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں۔

پرامن سول نافرمانی مسلمہ جمہوری سیاسی طریقہ کار ہے

پرامن سول نافرمانی کا یہ طریقہ کار برصغیر ہندو پاکستان میں ایک ایسے مسلمہ سیاسی طریقہ کار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً دونوں ڈومینئون میں لکھے ہوئے آئین کا کوئی اصول اتنا پرانا اور ایسا مسلم نہیں جیسا کہ پرامن سول نافرمانی کا اصول۔ کیونکہ پاکستان اور بھارت دونوں کے آئین خود اسی سول نافرمانی سے حاصل کی ہوئی، آزادی کے مرہون منت ہیں۔ تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ حصول آزادی کے بعد بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں جن سیاسی لیڈروں نے پرامن سول نافرمانی کے نام پر انگریز سے آزادی کے اختیارات حاصل کئے تھے۔ جب خود انہوں نے اپنے عوام کے بعض حقوق کو دبانا چاہا اور عوام نے اپنے مطالبات ان لیڈروں سے منوانے کی خاطر پرامن سول نافرمانی کا راستہ اختیار کیا۔ تو ان لیڈروں نے ایک الٹی زقند لگائی اور یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ سول نافرمانی تو ہمارے لئے انگریز کے خلاف جائز تھی۔ اب جب ہم حاکم بن چکے ہیں تو عوام کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ خود ہمارے خلاف بھی یہی ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیں۔ انگریز بیرونی حاکم تھا۔ ہم ملکی حاکم ہیں۔ لہٰذا انگریز کے خلاف سول نافرمانی آزادی کے مترادف تھی۔ ہمارے خلاف سول نافرمانی وطن سے غداری اور بغاوت کے مترادف ہے۔

آئین کے تحت وزارت بدلنا عوام کا جمہوری حق ہے

یہ منطق اس قابل نہیں کہ اس کا کوئی جواب دیا جائے لیکن یہ نامناسب نہ ہوگا کہ امریکہ کے ۴؍ جولائی ۱۷۷۶ء کے تاریخی اعلان آزادی سے ایک پیراگراف ان لوگوں کی شرح صدر کے لئے نقل کرایا جائے۔ جن پر آیات قرآنی اور فطری عدل و انصاف کے تقاضوں سے زیادہ اثر مہذب ممالک کی آئینی روایات کا ہوا کرتا ہے۔

"We hold these truth to be self-evident. that all men are created equal. That they are endowed by their creature with certain un-alienable rights, that among their rights are life, liberty and the persuit of hapiness. That to secver these rights governments are instituted among men. hariving their just powers from the concend of the government that when wer only form of government becomes destructive of there ends. it is the right of the people to altar or abolish the govenment, and to institute a new government laying its foundation an such principles and orgnising its powers in such form, as to them shall seem most likly to effect their safety and happiness."

"حسب ذیل اصول ہمارے ایک ایسے حق کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی سچائی از خود ظاہر ہے۔ یہ کہ سب انسان برابر ہیں۔ یہ کہ انسان کے خالق نے ہر فرد کو چند ایسے حقوق عطا کیے ہیں جو کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ ان حقوق میں زندہ رہنے کا حق، آزاد رہنے کا حق اور اپنی خوشی اپنی مرضی سے تلاش کرنے کا حق شامل ہیں۔

انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے جو نظام کھڑا کیا جاتا ہے اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان حقوق کو حق دار تک پہنچا دیا جائے۔ ہر حکومت کا اقتدار رعایا کی رضامندی سے اخذ کیا جاتا ہے۔ جب کوئی حکومت اس اصل مقصد سے منحرف ہو جائے تو رعایا کا حق ہے کہ ایسی حکومت کو موقوف کر دے۔ یا اسے بدل ڈالے۔ پہلی حکومت کی جگہ ایک نئی حکومت قائم کر لے۔ نئی حکومت کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جائے اور اس کو صرف وہ اختیارات سونپے جائیں جو رعایا کے نزدیک رعایا کے تحفظ اور خوش حالی کے لئے مفید مطلب ہوں۔"

۱۹۵۳ء میں کئی دوسری اسلامی جمہوری تحریکیں بھی کچلی گئی تھیں

امریکیوں نے یہ تاریخی اعلان آزادی تب شائع کیا تھا جب آج سے قریباً پونے تین

سو سال پہلے انگریز انہیں کہتے تھے کہ تمہارا ملک ہم نے آباد کیا ہے۔ تم شاہ برطانیہ کی رعایا ہو۔ لہٰذا ہم تم سے پوچھے بغیر تم پر ٹیکس لگا سکتے ہیں اور امریکی باشندے احتجاج کرتے تھے کہ:

"No taxetion without representation"

یعنی جس سیاست میں ہمیں نیابت حاصل نہیں۔ اس سیاست کو ہم سے ٹیکس وصول کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو اہل امریکہ اس اعلان آزادی کے نام پر ایک قوم بنے۔ ۱۹۵۳ء میں اسی امریکہ کے اثر و رسوخ نے مصر کے اندر کرنل ناصر سے "اخوان المسلمین" کا معصوم خون بہایا۔ ایران میں مصدق جیسے بطل جلیل اور محب وطن کو پابند سلاسل اور قید تنہائی کا اسیر کردیا گیا۔ فاطمی کو گولی ماردی گئی۔ اور فدایان اسلام کا وہ نواب صفوی جو قرآن مجید بغل میں لے کر شب و روز اسلامی حکومت کے قیام کی تبلیغ کرتا تھا۔ مارشل لاء کے ماتحت شہید کردیا گیا۔

کم و بیش یہ وہی ایام تھے جب پاکستان میں شہداء ختم نبوت اپنی جانیں جان آفریں کو سپرد کررہے تھے۔ شاید قدرت جب اپنے بندوں کا امتحان لیتی ہے تو ایک ہی وقت میں مختلف ممالک کے اندر یکساں عقیدے رکھنے والوں کو ایک ہی قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔

سابقہ معروضات کا لب لباب

ہم شہداء ختم نبوت کی یادگار منانے کے لئے اس کانفرنس میں جمع ہوئے ہیں۔ اس وقت تک میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یادگار آج سے چار برس پہلے اس پیمانے پر کیوں نہ منائی جا سکی۔ وہ کیا مطالبات تھے جن کی خاطر ان شہیدوں نے جانیں دیں۔ وہ مطالبات کیوں پیش کئے گئے تھے۔ جنہوں نے ان مطالبات کو نامنظور کیا اور بزعم خود شہداء کو نیست و نابود کردیا۔ آج وہ خود اور ان کی سیاسی جماعتیں اور ان کا اقتدار اور وہ تمام ادارے جن کی بناء پر وہ ظلم و ستم کرتے تھے۔ سب نیست و نابود ہو چکے ہیں۔

اس مرحلے پر میں اپنی گزارشات ختم کرنے سے پہلے دو مزید موضوعات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں:

اوّل...... یہ کہ کیا ہم صرف شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے پر اکتفا کریں گے اور ان کے ورثاء کی دست گیری کا کوئی اہتمام نہ کریں گے۔ کیا ہماری یہ کانفرنس صرف کانفرنس تک محدود رہے گی اور ہم شہداء کی یادگار کے لئے کوئی ٹھوس آثار کھڑے نہ کریں گے؟

دوسرے...... یہ کہ یادگار تو ہم نے منالی۔ جن کی یادگار منائی تھی ان کا چرچا بھی ہم نے

کردیا۔ لیکن کیا ہم ان قابل یادگار ہستیوں کی زندگی سے خود کوئی سبق حاصل نہ کریں گے۔ اور ان کی پیروی میں ہم دین وملت کی خدمت انجام دینے کا کوئی منصوبہ نہ بنائیں گے؟

جدید سرکاری تحقیقات کی ضرورت

جہاں تک شہداء کے ورثاء کی نگہداشت کا تعلق ہے میں حسب ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں:

ا...... ۱۹۱۹ء میں جب برطانوی حکومت نے پنجاب میں مارشل لاء لگایا تھا تو اس کے بعد مارشل لاء کے دوران میں جن لوگوں کو جانی یا مالی نقصان پہنچایا کسی افسر نے اپنے فرائض منصبی سے تجاوز کیا۔ اس کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق نقصان اٹھانے والوں کو معاوضہ بھی دیا گیا تھا۔ معاوضہ کی رقم کا تعین کرنے کے لئے الگ کمیشن مقرر ہوا تھا۔ جس میں عوام کے نمائندے بھی شامل تھے۔ ۱۹۵۳ء کے مارشل لاء کے متعلق اگرچہ ایک عدالت انکوائری کر چکی ہے۔ لیکن اس انکوائری میں عوام کے جانی اور مالی نقصان کا اندازہ کرنا شامل نہ تھا۔ نہ ہی فرائض منصبی سے تجاوز کرنے والے افسروں کی کوئی پرستش کی گئی۔ بلکہ یہ عدالت تو اس مفروضے پر مقرر کی گئی تھی کہ مارشل لاء کا نفاذ بہر صورت ضروری تھا۔ اس کے نفاذ میں تاخیر کیوں ہوئی۔ اب جب کہ حالات بدل چکے ہیں ہیں اور Indimnity act کو منظور کرنے والی نہ وزارت باقی ہے نہ وہ پارلیمنٹ باقی ہے تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام اور پارلیمنٹ کے نمائندوں پر مشتمل ایک ایسا کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ تحقیق کرے کہ عوام کو کس قدر جانی اور مالی نقصان پہنچا۔ اختیارات سے تجاوز کی کون سی مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں مجروحین اور شہداء کے ورثاء کو معقول مالی معاوضہ دیا جائے۔ شہر کی جن املاک کو نقصان پہنچا۔ ان کی مرمت کی جائے۔ جن جماعتوں یا افراد کا سرمایہ ضبط کر لیا گیا تھا۔ وہ انہیں واگزار کر دیا جائے۔ جن لوگوں کو ناواجب جرمانے کئے گئے، وہ واپس کئے جائیں۔ جن کو ناجائز سزائیں ملیں، ان کو ہرجانہ دیا جائے۔ اور جن افسران نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ان کو مناسب سزا دی جائے۔

۲...... شہداء ختم نبوت کے اعزاز میں چھ مارچ کو مکمل تعطیل ہوا کرے۔

۳...... تمام مغربی پاکستان کے جن جن مقامات پر شہداء پر آتش باری کی گئی۔ وہاں یادگاری مینار نصب کئے جائیں اور ان پر ایک تختی لگا کر اس پر مختصر حالات درج کئے جائیں اور جو لوگ شہید ہوئے۔ ان کے نام ولدیت، جائے سکونت اور عمر کی بھی وضاحت کی جائے۔

۴...... شہداء کے مزارات کی جہاں نشان دہی ہو سکے۔ وہاں سرکاری خرچ پر ان کے مزارات

کی تعمیر کی جائے اور الواح مزار نصب کی جائیں۔

۵...... دہلی دروازہ لاہور کے باہر جو نیا چوک تعمیر ہو رہا ہے۔ اس کا نام چوک شہیداں ختم نبوت رکھا جائے اور چاروں جانب یہ نام مناسب حروف میں لکھے جائیں۔ ان حروف پر چراغاں کا مناسب انتظام کیا جائے۔

۶...... جہاں تک تحریک کے مطالبات کا تعلق ہے۔ ان میں سے سر ظفر اللہ کو منصب سے ہٹائے جانے کا مطالبہ پورا ہو چکا ہے۔ لیکن کلیدی آسامیوں پر تقررات اور پاکستان میں اقلیتوں کے تعین کے مسائل بدستور قائم ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس پاکستان کے اندر مذہبی یا سیاسی جماعتوں نے متوازی حکومت کے نمونے قائم کر رکھے ہیں۔ اور حکومت پاکستان کی طرح ان کی جداگانہ وزارتیں اور فوجیں ہیں۔ انہیں خلاف قانون جماعتیں قرار دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تفتیش اور قابل اعتراض لٹریچر کی ضبطی نہایت ضروری ہے۔

ہمارا فرض

اب میں اس موضوع کی جانب رجوع کرتا ہوں کہ شہداء ختم نبوت کی یادگار منانے سے ہم خود کیا عملی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ آج دنیا میں جو اضطراب بد امنی اور نفسا نفسی کا عالم ہے۔ اس کے اثرات ہم سب کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ اگر ہم میں کوئی ایسے افراد بھی شامل ہیں۔ جو احساس اخلاق سے عاری ہو چکے ہیں۔ اور دین کی خاطر یا اجتماعی مفاد کی خاطر کسی کوشش پر آمادہ نہیں تو ان کی انفرادی زندگی کے مفاد بھی انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ اصلاح احوال کی جانب مائل ہوں۔

میں اس نکتے کے متعلق اپنی معروضات پہلے پیش کر چکا ہوں کہ تحفظ ختم نبوت کس طرح پاکستان میں انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا مرکزی نقطہ ہے۔ میں خاص طور پر تین طبقات سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ ان کے فوری مفاد کا تقاضا ہے کہ وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے پروگرام کی روشنی میں اپنی روزمرہ کی زندگی کا جائزہ لیں۔

نوجوانوں کو دعوت عمل

۱...... میرا پہلا خطاب نوجوانوں اور طالب علموں سے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے زندگی کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔ نہ ان کی عادات میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا ہے۔ بلکہ وہ مستقبل کے منتظر ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں میں انقلاب ہمیشہ طالب علموں نے پیدا کیا ہے۔ مصر کو

انگریز کے پنجے سے قاہرہ کے طلباء کی طول وطویل جدوجہد نے چھڑایا۔ روس میں انقلاب طالب علموں کی مدد سے آیا۔ چین میں چیانگ کائی شیک کو طالب علموں نے بھگایا اور خود اس پاکستان کی تاریخ پر غور کیجئے کہ جب قائداعظم کو یونینسٹ پنجاب میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے تو یہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نوجوان اراکین ہی تھے جنہوں نے سیاست کا رخ اور اقتدار کا پانسہ الٹ کر رکھ دیا۔ آج ملک میں جو بیماری، بھوک، افلاس، بے حیائی، فحاشی اور انحطاط وزوال پرورش پا رہا ہے۔ بوڑھوں کو تو شاید اس کی پرواہ نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی گزار چکے اور اب میں ان پہ سکت بھی باقی نہیں کہ وہ نا مساعد حالات کا مقابلہ کر سکیں۔

وہ حالات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن میں نوجوانوں سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے راستے سے وہ کوڑا کرکٹ ہٹانا نہیں چاہتے، جس کی سڑاند سے تمہارے نتھنے نفرت کرتے ہیں۔ اٹھو اور پاکستان کے دیہات کے کونے کونے میں پھیل جاؤ۔ تمہیں ہر جگہ ایسے نوجوان ملیں گے جو تمہاری طرح بدی سے نفرت اور نیکی کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس وہم سے بددل ہو چکے تھے کہ کوئی ان کا ساتھی نہیں۔ شاید ان کی کوششیں کوئی پھل نہیں لا سکتیں۔ ان کی تمناؤں کو آواز بازگشت سے ہرا کر دو۔ آرزوؤں کے بیج بو کر تو دیکھو ایک ہی فصل کے اندر وہ کھیتی کھڑی ہو جائے گی جس سے تمہاری جھولیاں بھرپور ہو جائیں گی۔

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل

۲...... میرے دوسرے مخاطب علماء، ائمہ مساجد اور مشائخ ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جن سے تخت حکومت چھن جاتا ہے وہ تو اس امید پر صابر ہو کر گوشہ نشین ہو جایا کرتے ہیں کہ حجرے اور بوریے پر قناعت کر کے گزارہ کر لیں گے۔ لیکن تم سے تو مصلیٰ اور منبر، حجرہ اور مسجد چھنا جا رہا ہے۔ یہاں سے نکل کر کہاں گزارہ کرو گے۔ بادشاہوں سے تو بیزاری اختیار کی جا سکتی ہے لیکن تحریک تحفظ ختم نبوت سے روگردانی کی، تو صرف اس دنیا میں تم پر آوازے نہ کسے جائیں گے کہ دیکھو قوم کے نونہالوں کے خون کی قربانی دے کر یہ لوگ جو رسول کے نائب ہونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ اب ناموس رسول کی نسبت اپنے فرض سے بھی غافل ہو گئے ہیں۔ بلکہ جب اس روز کا سامنا ہوگا۔ جس سے کسی کو مفر نہیں تو بتاؤ شافع محشر کو جا کر کیا جواب دو گے؟

تم اس لئے بددل ہو گئے کہ تمہاری داڑھیوں کی بے حرمتی کی گئی تھی یا جیل میں تم سے وہ سلوک نہ ہوا تھا جس کے تم مستحق تھے۔ لیکن ان دین کی محبت رکھنے والوں، کو علم دین سے تمہارے

جتنا حصہ نہ پانے والوں کا بھی خیال تو کرو جنہوں نے گردنیں کٹا دیں۔ اپنے سلف سے سبق حاصل کرو۔ اپنے مقام کو پہچانو۔ آپ وہ لوگ ہو جو وقت سے منہ موڑا نہیں کرتے۔ بلکہ وقت کے دھارے کا رخ پھیر دیا کرتے ہیں۔ اگر تدبیر میں کوئی غلطی رہ گئی تھی۔ تو اس کی تصحیح کر لیجئے اور نیت میں ہی کچھ کمی تھی۔ تب بھی وقت باقی ہے۔ اس کمی کو بھی پورا کر لیجئے۔

چھوٹے سرکاری ملازم کلرک اور غریب تاجر توجہ کریں

۳...... تیسرے درجہ پر میرے مخاطب متوسط تجارتی طبقے اور ادنیٰ سرکاری ملازمت پیشہ افراد ہیں۔ ممکن ہے یہ طبقہ جیالے پن اور دلیری میں عوام سے کچھ پیچھے ہو۔ لیکن بہر صورت وہ اپنے خاندانوں میں شرافت کا کچھ معیار باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ حرام و حلال کی تمیز سے بالکل بے بہرہ نہیں۔ عاقبت کا خوف انہیں ہر وقت نہیں تو کبھی کبھار آ ہی جاتا ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جن کو خدا نے دنیا سے زاید حصہ دے دیا ہے۔ وہ تو شاید اس لئے تحفظ ختم نبوت سے غافل ہیں کہ ان کو زندگی کے دوسرے نشے میسر ہیں۔ لیکن جس نے شراب بھی نہیں پی۔ خنزیر بھی نہیں کھایا اور بدکاری بھی نہیں کی۔

آخر وہ ایسا کرنے والوں کو خالی دیکھ کر ذہنی تصورات میں ہی ایسا کیوں الجھ گیا ہے کہ نہ حلال میں اپنے جائز حصہ کی فکر ہے اور نہ حرام کی سزا سے اپنے آپ کو بچانے کا خیال۔ ذرا تو غور کرو کہ یہ تہذیب اور یہ تعلیم جو ہمارے اندر نفوذ کر رہی ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ یہی نہ کہ کتے کی طرح حکم مانو اور دستر خوان سے بچی کھچی ہڈیاں کھا کر پیٹ موٹا کر لو۔ پھر ریچھ کی طرح رقص کرو، اور بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے بچے نوچو۔ فرصت ملے تو گدھ کی طرح مردار کھا کر اپنے تودہ غلاظت پر خود ہی بیٹھے اونگھتے رہو۔

ان تمام آلودگیوں سے نجات دلا کر تمہاری جائز توقعات کو پورا کرنے، تمہاری خاندانی شرافت کو بچانے اور جن چیزوں کی تم قدر کرتے ہو۔ ان کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس نبی ﷺ کے منصب کی حمیت کو فراموش نہ کرو۔ جس کی تعلیم کے بغیر تمہاری اس دنیا اور اس دنیا کی زندگی کو سنوارنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔

جمہور کی اسلامی تربیت اور بیداری

اگر یہ تینوں طبقات میری معروضات پر کان دھریں تو میں کہتا ہوں جس کے پاس

فرصت ہے۔ لیکن استطاعت نہیں وہ اپنے کچھ اوقات تحفظ ختم نبوت کے لئے وقف کردے۔ جس کے پاس استطاعت ہے۔ لیکن فرصت نہیں وہ اپنی استطاعت سے ان کا ہاتھ بٹائے جو اپنے اوقات فراغت کو اس نیک کام پر صرف کرنے کے خواہشمند ہیں۔ جس کے پاس اہلیت اور صلاحیت کار ہے۔ لیکن فرصت اور استطاعت دونوں نہیں وہ ان دونوں کو صحیح راستے پر چلنے کے لئے صائب مشورے دے۔

اس طرح ہر پاکستان اپنی ضروریات کو کچھ کم کر کے اپنی استطاعت کا ایک حصہ تحریک کے لئے وقف کردے۔ آخر رمضان میں روزے بھی رکھتے ہو۔ ایک دن ایک وقت کا کھانا نہ کھاؤ۔ جو سینما اور اس قسم کی دوسری لغو تفریحات میں اپنے اوقات اور اپنی استطاعت دونوں ضائع کرتے ہیں۔ وہ مہینے کے کچھ روز اپنی وافر آمدن تحریک کے لئے وقف کردیں۔ یہ پس انداز پونجی خود اپنے ہی پاس علیحدہ رکھو۔ تم ہی اس کو رسول کی منت سمجھ کر خود ہی اس کے امانت دار بن جاؤ۔ پھر ہر ہفتے میں ایک یا دو روز اس کام کے لئے وقف کردو۔ جو لاہور سے باہر نہیں جاسکتے وہ کسی ایسے محلے میں جائیں۔ جہاں ان کی واقفیت ہے جو باہر جاسکتے ہیں۔ وہ کسی ایسے شہر یا قصبے میں جائیں۔ جہاں ان کی شناسائی ہے اور جو صاحب ہمت اپنے اندر یہ اہلیت محسوس کریں، وہ دور افتادہ دیہات میں پہنچیں۔ "تحفظ ختم نبوت" کیوں ضروری ہے اور اس کے لئے کیا عمل ہم سب پر فرض ہے۔

یہ مسئلہ خود آپ پر پوری طرح واضح نہیں تو میں نے ابھی آپ کے سامنے جو معروضات پیش کی ہیں۔ وہ آپ کو ایک پمفلٹ کی شکل میں "تحریک تحفظ نبوت" کے لاہور کے دفتر کی معرفت مل سکتی ہیں۔ انہیں کو پڑھ لیجئے جس حصے کو آپ پسند نہ کریں اسے قلم زن کردیجئے۔ آپ کو جو بہتر تجویز سوجھے اسے خود لکھ لیجئے۔

بہر حال اس پیغام کو ایک ایک پاکستانی گھرانے کے ایک ایک بچے، بوڑھے اور مستورات تک پہنچادیجئے۔ خواتین گھروں کے اندر رہ کر خود اپنے خاندان کے افراد کو تلقین کریں۔ عورتیں جب چاہتی ہیں تو رشتے داروں کے پرانے جھگڑوں کو مٹا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے شوہروں اور اپنے بھائیوں کو اپنی منت سماجت سے ہمیشہ قائل کرسکتی ہیں اور جب اس کے الٹ چاہیں تو دوستوں کے اندر پھوٹ بھی ڈلوا دیتی ہیں۔ ان کے لئے بھی توشہ آخرت

یہی ہے کہ کسی مرد کو اس وقت تک کھانے، سونے اور آرام سے بیٹھنے کی مہلت نہ دیں۔ جب تک کہ وہ تحفظ ختم نبوت کے لئے کسی نہ کسی ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

ایک انقلاب کروٹ لے رہا ہے

جب ساری قوم اس ایک عزم سے سرشار ہو کر اٹھے گی تو حالات بدل جائیں گے۔ فضا بدل جائے گی۔ سیاست کا رخ بدل جائے گا۔ تمہاری قسمت اور تمہاری بے چارگی بھی بدل جائے گی۔ تمہیں ان لیڈروں سے نجات مل جائے گی۔ جو تحفظ ختم نبوت کی نسبت اپنی نفس پروری ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ان جھوٹے رہنماؤں کو چھوڑ کر اس کی پیروی نہ کریں جو دونوں جہانوں کا بادشاہ ہونے کے باوجود ایک کالی کملی پر گزارہ کرتا تھا۔ ایک کھجور کے بوریے پر سوتا تھا۔ کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتا تھا۔ قوم کو یہ سبق دیتا تھا کہ میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔ غلطی سے کسی مسکین کو کوڑا لگ جائے تو اپنی پیٹھ ننگی کر کے اس کے سامنے عاجزی سے کھڑا ہو جاتا تھا کہ بھائی اتنی ہو، تو کیا ہے۔ مجھ سے تمہیں تکلیف پہنچی، اپنا بدلہ لے لو۔

ختم نبوت ایک نئی دینی اور دنیاوی زندگی کا پیغام ہے

اگر تمہاری نگاہیں ان رموز و اسرار کو نہیں پہنچ سکتیں۔ جو معراج میں پوشیدہ تھے اگر تم ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اس نبی ﷺ کے مقام سے آگاہ نہیں ہو سکتے تو کم از کم اتنا تو دیکھ سکتے ہو کہ وہ کیمونزم جس کا سٹالین غریبوں کے نام پر امیریاں کرنے لگ گیا تھا اور وہ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس کی جمہوریتیں جو الجزائر اور فلسطین کے مظلوموں کو گولیوں سے حریت کا سبق دیتی ہیں اور مسلمان ممالک میں وطن پرستی کی تحریکوں کے وہ سربراہ جو اپنے مفاد کی خاطر قومی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ تمہیں تمہاری زندگی بہتر بنانے ترقی کرنے اور تمہارے دکھوں اور تکالیف سے نجات دلانے کی خاطر وہ مثال مہیا نہیں کر سکتے جو کہ تمہارا اپنا آقا اور مولا مہیا کر سکتا ہے۔

"وصلی الله تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد وآله واصحابه والتابعین وتبع التابعین وسلف الصالحین وبارك وسلم علیهم اجمعین"